ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ

جلد ۳۰

عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

دارالاسلام - جمال پور - پٹھانکوٹ

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸

فہرست مضامین

جلد ۳۰	ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ مطابق مارچ ۱۹۴۷ء	عدد ۴

ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چمبرلین روڈ میں چھپوا کر دارالاسلام پٹھانکوٹ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

افسوس ہے کہ پنجاب اور سرحد کے فسادات کی وجہ سے اس سال جماعت کا اجتماع عام، جو اپریل کی ابتدائی تاریخوں میں پٹنہ میں منعقد ہونے والا تھا، منعقد نہ ہو سکا۔ اس سال کے اجتماع کے لیے بہار کا انتخاب بہت سے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ جاہلی سیاست اور خدا ناترس قیادت کے نتائج بد سے جس صوبہ کو سب سے زیادہ دوچار ہونا پڑا ہے اس سال ہم اپنا سالانہ اجتماع اسی صوبہ میں کریں اور لوگوں کو برسر موقع بتائیں کہ وہ کیا بنیادی خرابیاں ہیں جن کی وجہ سے اس ملک کے باشندے ایک دوسرے کے لیے درندوں سے زیادہ سنگدل اور خونخوار بن گئے ہیں اور یہ کہ وہ کیا اصول زندگی ہیں جن کو اختیار کرنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ دنیا میں انسان اپنے لیے اور دوسروں کے لیے حقیقی بہبود کے کام کر سکے اور اس کے ہاتھوں وہ نظام زندگی برپا ہو سکے جو سب کے لیے امن و عدل کا یکساں محافظ ہو۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر بہار کے ذہین طبقہ کے کچھ حصہ کو ہم اپنے خیالات سمجھا سکے تو اس سے نہ صرف بہار کی مشکلات حل کرنے میں مدد ملے گی بلکہ ممکن ہے یہ پورے ملک کی سیاست کا رخ بدلنے میں معین ہو سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ عین اس زمانہ میں جب کہ اجتماع کی تاریخیں بالکل قریب آ لگی تھیں دفعتہً پنجاب میں فساد کی ایک چنگاری چمکی اور آناً فاناً انبالہ سے لے کر پشاور تک پورے شمالی ہند کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان حالات میں شمالی ہند کے ارکان کے لیے (اور اب تک جماعت کے ارکان کی بڑی تعداد شمالی ہند ہی کے لوگوں پر مشتمل ہے) بہار کا سفر نہایت مشکل تھا۔ اولاً تو ریل اور ڈاک کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا تھا، ثانیاً نہ شہروں میں کسی کو اپنے جان و مال کی طرف سے اطمینان تھا نہ دیہاتوں میں۔ ایسی حالت میں شاید بہت ہی تھوڑے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر پٹنہ پہنچنے کی ہمت کر سکتے۔ اور اگر خدانخواستہ سندھ بھی اس کی لپیٹ میں آ جاتا (جس کا اچھا خاصا اندیشہ موجود تھا) کہ دہلی، یو۔پی اور بہار وغیرہ میں بھی

رجوع ہوجاتا (جس کا شروع ہوجانا بحالات موجودہ کچھ بعید نہ تھا) تو پٹنہ کا اجتماع یا تو سرے سے منعقد ہی نہ ہوسکتا اور اگر کسی طرح منعقد ہوجاتا تو اس کی حیثیت کل ہند اجتماع کی تو بہرحال نہ ہوتی۔ اس وجہ سے بہتر یہی خیال کیا گیا کہ اس کو ملتوی کردیا جائے۔

اس التوا کے اعلان کے بعد مقامی ارکین شوریٰ اور بعض دوسرے رفقائے جماعت کی موجودگی میں اجتماع سالانہ کے مسئلہ پر مزید غور کیا گیا تو ملک کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہر شخص نے یہی رائے دی کہ نہ صرف اس وقت بلکہ ادھر کچھ عرصہ تک کسی آل انڈیا اجتماع کے انعقاد میں سخت دشواریاں ہیں اس وجہ سے بہتر یہ ہے کہ اس سال اجتماع سالانہ کا خیال ترک کردیا جائے اور اس مقصد کو، جو سالانہ اجتماع سے پورا ہوتا تھا، حلقہ وار اجتماعات سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ رائے مختلف پہلوؤں سے قرین مصلحت نظر آئی اس وجہ سے اگرچہ (وقت کی تنگی اور وسائل آمدورفت کے تعطل کی وجہ سے) تمام ارکین شوریٰ سے استصواب ناممکن تھا تاہم یہ رائے اختیار کرلی گئی اور حلقہ وار اجتماعات کے لیے مقامات اور تاریخوں کا فیصلہ کرکے اعلان کردیا گیا۔ یہ فیصلہ بالکل وقت کے وقت کیا گیا ہے، نہ شوریٰ کے ارکین سے مشورہ کیا جاسکا ہے، اور نہ دوسری مقامی جماعتوں ہی سے کوئی استصواب کیا جاسکا ہے اس وجہ سے ممکن ہے بعض جگہ کارکنوں کو وقت کی تنگی اور موجودہ مشکلات کی وجہ سے زحمتیں پیش آئیں لیکن اب اس میں کچھ زیادہ ترمیم و تغیر کی گنجائش نہیں ہے اس وجہ سے تمام ارکان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے حالات کو ان تاریخوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں۔ اس ملک میں ہم کو اس وقت جن حالات سے سابقہ ہے اور آئندہ جن حالات سے سابقہ پڑنے کا اندیشہ ہے ان کا تقاضا ہے کہ ہمارے کارکنوں کو اس بات کی مشق ہو کہ وہ فوری نوٹس پر کسی بڑے اجتماع کا انتظام کرسکیں اور اسی طرح ہمارے عام ارکان کو یہ عادت ہو کہ وہ فوری بلاوے پر اکٹھے ہوجایا کریں۔

بہار میں جماعت کے زیر اہتمام | ہورہا ہے اس کی تفصیلات جاننے کا قدرتی طور پر لوگوں میں

شوق ہوگا لیکن ان صفحات میں وہاں کے کاموں کا کوئی ذکر دو وجہوں سے نہیں آسکا۔ ایک یہ ہے کہ ہم وہاں جو خدمت انجام دینا چاہتے ہیں اس کو ٹھیک ٹھیک اپنے نصب العین کے مطابق انجام دینے کے لیے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ یہ کام سرتاسر جماعت کے سرمایہ اور جماعت کے کارکنوں کے ہاتھوں انجام پائے اس سبب سے نہ عام پبلک سے اس کام میں شرکت کے لیے کوئی اپیل کی گئی اور نہ اخبارات کے صفحات میں اس کا کوئی چرچا مناسب معلوم ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے وہاں کے لیے کام کا جو نقشہ تیار کر کے کارکنوں کے حوالہ کیا ہے وہ کسی عاجلانہ اور فوری کام کا نقشہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک صبر آزما اور دیر طلب پروگرام ہے اس وجہ سے اس کی کوئی واقعی رپورٹ اسی وقت پیش کی جا سکتی ہے جبکہ ہمارے کارکن اپنے پروگرام کو پورا کر کے وہاں سے واپس آجائیں۔ اس سے پہلے وہاں کے کاموں کی کوئی تفصیل بتانا مشکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ خاکہ بتایا جا سکتا ہے جو وہاں ہمارے رفقا کے سامنے ہے اور جس کی تکمیل کے ارادہ سے وہ اب تک وہاں جمے ہوئے ہیں اور جب تک ضرورت محسوس کریں گے انشاء اللہ صبر و استقلال کے ساتھ جمے رہیں گے۔

بہار میں چند قسم کے کام ہمارے رفقاء کے سامنے ہیں۔

۱۔ سب سے مقدم کام یہ ہے کہ وہاں کے مسلمانوں پر اکثریت کے بے تحاشا مظالم اور تعداد کی غیر معمولی کمی کی وجہ سے خوف و ہراس کی جو حالت طاری ہو گئی ہے اس کو دور کر کے ان کی ہمت بندھائی جائے اور ان کے حوصلہ کو قائم رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اس بات کی ضرورت کچھ تو اس وجہ سے تھی کہ جو لوگ بہار میں مسلمانوں کے پیش پیش تھے ان کے ذہن خود منتشر تھے جس کی وجہ سے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی ہمت ہاری ہوئی بھیڑ کی پراگندگی کو دور کر کے اس کو از سر نو مجتمع اور پا بر جا کر سکیں گے اور کچھ اس وجہ سے تھی کہ آج مسلمان لیڈروں پر بھی قومیت پرستی کی وہی رنگ مسلط ہے جو دنیا کی دوسری قوموں پر مسلط ہے اس وجہ سے یہ مسلمانوں کی پست ہمتی کو دور کرنے کے لیے اگر کچھ کر سکتے ہیں تو صرف یہ کہ سکتے ہیں کہ ان کے قومی تعصب کو بھڑکا کر ان کے اندر کچھ جوش پیدا کر دیں۔

ہمارے نزدیک اس طرح کا جوش بجائے خود ایک مہلک بیماری ہے جس کو اسلام نے حمیت جاہلیت کے نام سے پکارا ہے۔ اس وجہ سے ہم نے یہ چاہا کہ اس موقع پر ہم اپنے امکان بھر بہار کے مسلمانوں کے اندر وہ صحیح اسلامی روح پیدا کرنے کی کوشش کریں جو موجودہ خطرناک حالات میں ان کی ہمت بھی بندھائے اور ان کے اس طرز فکر اور طریق کار میں بھی تغیر پیدا کرے جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو ایک اقلیت کی حیثیت میں پا رہے ہیں اور ان کے غیر مسلم پڑوسی ان کو اپنے لیے رحمت کے بجائے مصیبت خیال کر رہے ہیں۔ ہم اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ اگر مسلمان سچے مسلمان بن جائیں اور اپنی ان ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ جائیں جو شہداء اللہ فی الارض ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے غیر مسلم بھائیوں کی اصلاح سے متعلق ڈالی ہیں تو کم از کم جہاں تک خود ان کا تعلق ہے ان کا رویہ اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ فوراً ہمدردانہ ہو جائے گا اور توقع ہے کہ اس کے جواب میں غیر مسلموں کے رویہ میں بھی نہایت خوشگوار تبدیلیاں ہوں گی اور وہ اپنے اچھے پڑوسیوں کی اچھی باتوں اور ان کے اچھے کاموں سے اچھے سبق لیں گے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا (جس کا اندیشہ بہت کم ہے) بلکہ وہ مخالفت اور عداوت ہی پر تلے رہے اور اس عداوت و مخالفت کے جنون میں انھوں نے اس سے زیادہ مظالم مسلمانوں پر ڈھائے جو انھوں نے بہار میں پچھلے مہینوں ڈھائے ہیں تو اس سے مسلمانوں پر وہ خوف و ہراس نہ طاری ہوگا جو اس وقت طاری ہے بلکہ ان کی سچی خدا ترسی کی وجہ سے ان مظالم سے ان کی ہمت و قوت میں اضافہ ہوگا اور وہ شکستہ دل ہونے کے بجائے دگنے جوش و حوصلہ کے ساتھ نہ صرف اپنے کام کو جاری رکھیں گے بلکہ اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے غیر مسلموں کے ساتھ اپنی شفقت و ہمدردی بھی باقی رکھیں گے۔ اس صورت میں لازمی طور پر اللہ کی مدد ان کے ساتھ ہوگی اور کچھ سنگ دل قسم کے لوگ اگر ان کو ستائیں گے، ان کو گھروں سے نکالیں گے اور ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کے درپے ہوں گے تو خود انہی غیر مسلموں کے اندر سے ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جو اپنے ان صالح اور مصلح پڑوسیوں کے ساتھ نہ صرف ہمدردی کریں گے بلکہ ان کا پورا پورا ساتھ دیں گے لیکن قوم پرستی کا برا ہو کہ اس نے اس سیدھی اور صاف راہ کی طرف آنے سے مسلمانوں کو روک رکھا ہے۔

اور اب ان میں دو ہی قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں یا تو وہ لوگ ہیں جو وطنی قومیت کے خبط میں مبتلا ہو کر مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز ہی سرے سے کھو بیٹھے ہیں یا پھر وہ لوگ ہیں جو نسلی قومیت کے تعصب میں اس قدر خود باختہ ہو گئے ہیں کہ اپنے اور غیر مسلموں کے درمیان عداوت کے تعلق کے سوا اور کسی تعلق کا امکان ہی نہیں سمجھتے۔

۲- دوسرا کام ہمارے رفقاء کے سامنے یہ ہے کہ مسلمانوں کو مشورہ دیں کہ اپنی بستیاں الگ الگ خطوں (Pockets) کی شکل میں بسائیں۔ یہ مشورہ درحقیقت ہے تو حکومت کے سامنے پیش کرنے کا کیونکہ یہ کام عام لوگوں کے کرنے کا نہیں بلکہ حکومت ہی کے کرنے کا ہے لیکن جن لوگوں کے ہاتھوں میں آج حکومت کی باگ ہے ان سے ہم کو یہ امید نہیں ہے کہ وہ اپنے اغراض کے خلاف کوئی بات محض اس وجہ سے مان لیں گے کہ وہ معقول اور امن پسندانہ ہے اس وجہ سے ہم نے یہ راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے کارکنوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مسلمان بستیوں کا کوئی خاص حلقہ منتخب کر کے وہاں کے مسلمانوں کے اندر انصار اور مہاجرین کی اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جن لوگوں کو منتقل کرنا ہو ان کے اندر ایسا جذبہ پیدا کیا جائے کہ ان کو اپنا اخلاقی اور دینی مفاد اتنا عزیز ہو جائے کہ اس کے لیے وہ ہر طرح کی عسرت اور تکلیف برداشت کر لینے پر آمادہ ہو جائیں اور جن لوگوں کی طرف منتقل کرنا ہو ان کے اندر ایثار کا وہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ وہ منتقل ہونیوالوں کو بخوشی اپنی زمینوں اور اپنی املاک میں شریک بنانے پر راضی ہو جائیں۔ اصلی چیز دلوں کے اندر جگہ پیدا ہونا ہے جب یہ چیز پیدا ہو جائے گی تو زمین بھی فراخ ہو جائے گی اور وسائل معیشت میں بھی برکت ہو گی۔ اس طرح ایک پاکٹ بھی اگر مسلمانوں کے اپنے ہمت و ایثار سے بنگیا تو اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہو گا کہ اس کوشش میں آپ سے آپ مسلمانوں کی اخلاقی تربیت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہو جائے گی اور دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ یہ پاکٹ ایک نمونہ کا کام دے گا جس کی نقل دوسرے خطوں کے مسلمان بھی کریں گے اور اس طرح آہستہ آہستہ یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر بلکہ اس کے علی الرغم انجام پا جائے گا اور جب

حکومت یہ محسوس کرے گی کہ اقلیت اپنے تحفظ کے جائز وسائل اختیار کرنے پر تل گئی ہے تو بالآخر وہ بھی مجبور ہوگی کہ ان کے املاک و جائداد کے لیے کوئی ایسی شکل پیدا کرے کہ حقدار اپنے حقوق سے محروم نہ رہیں۔

۳۔ تیسری چیز ہمارے رفقاء کے سامنے یہ ہے کہ اپنی استطاعت بھر امداد کا کام (ریلیف) کریں۔ اس سلسلہ میں ہم نے اپنے کارکنوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ اس معاملہ میں مسلم و غیر مسلم کے درمیان ہرگز کوئی تفریق نہ کی جائے۔ اگر غیر مسلم بھی امداد کے مستحق ہوں تو ان کی بھی تا حد امکان ہر طرح کی امداد کی جائے۔ نیز ہم کو یہ معلوم ہوا تھا کہ بہار کے آفت زدہ علاقہ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو یوں تو سخت محتاج مدد ہیں لیکن وہ ریلیف کمیٹیوں اور امدادی کیمپوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ یہ اپنی شرافت اور خودداری کی وجہ سے ریلیف کمیٹیوں اور امدادی کیمپوں کے دروازے کھٹکھٹانے پر آمادہ نہیں ہیں اور کوئی ایسا امدادی ادارہ اس علاقہ میں موجود نہیں ہے جو خود ان کا کھوج لگا کر ان کی امداد کرے۔ ہم نے اس ضرورت کو محسوس کر کے اپنے کارکنوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ امکانی کوشش کر کے اس طرح کے متعفف اور خوددار لوگوں کا سراغ لگائیں اور ان کے حالات درست کرنے کی کوشش کریں۔ علاوہ ازیں ایسے لوگوں کی تعداد بھی فسادزدہ علاقہ میں کچھ کم نہیں تھی جو اپنے قیمتی سامان اور املاک از قسم زیورات وغیرہ اونے پونے بیچ رہے تھے ہم نے اس سلسلہ میں بھی کچھ ضروری ہدایات اپنے کارکنوں کو دی ہیں کہ اول تو وہ لوگوں کو اس طرح کے اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کریں اور اگر باز رکھنا ممکن نہ ہو تو کم از کم اس کا بندوبست کیا جائے کہ ان کی چیزیں بازار کے نرخ پر بک جائیں۔

یہ ہدایات دے کر ہم نے جنوری ۱۹۴۸ء کے آخر میں اپنے محترم رفیق جناب محمد عبدالجبار صاحب غازی کو پٹنہ بھیجا اور ان کی امداد کے لیے چند مقامی ارکان و ہمدردان جماعت پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ بھی بنا دی تاکہ خاص اہمیت رکھنے والے مسائل کے سوا اور سارے امور برسر موقع ہی طے کر لیے جایا کریں

مرکز کی ہدایات کے انتظار میں کاموں میں کوئی تاخیر واقع نہ ہو۔ نیز غازی صاحب موصوف کو یہ اختیار بھی دیدیا گیا ہے کہ وہ جماعت کے ارکان میں سے جن لوگوں کو چاہیں اپنی امداد کے لیے بلا سکتے ہیں اور عارضی طور پر جماعت کی تربیت گاہ بھی پٹنہ میں منتقل کر دی گئی ہے تاکہ تربیت گاہ میں شریک ہونیوالے ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ عملی تربیت بھی حاصل کر سکیں۔ ان سارے کاموں کی تکمیل کے لیے کافی سرمایہ کی ضرورت تھی اور ہے لیکن ہمارے پاس نہ تو مرکز میں اتنا محفوظ سرمایہ تھا کہ اس کے بل بوتے پر اتنے بڑے کام کا آغاز کر سکتے اور نہ جماعت ہی کی مالی حالت ایسی تھی کہ اس کے اعتماد پر یہ کام شروع کر سکتے تاہم اللہ کا نام لے کر ہم نے کام شروع کر دیا اور چندے کی کوئی عام اپیل کرنے کے بجائے جماعت کے کارکنوں اور ہمدردوں کو ایک گشتی مراسلہ کے ذریعہ سے اطلاع کر دی کہ وہ جو امدادی رقم بھیج سکیں پٹنہ کی مقامی جماعت کے پتہ پر بھیجیں۔ اس طرح ہماری مختلف شاخوں سے جو رقمیں ہمیں موصول ہوئی ہیں اس کی مجموعی مقدار اس وقت تک ...... ۲۷ ہزار ہے۔

ان ارادوں اور اس سرمایہ کے ساتھ ہمارے جو رفقاء بہار میں کام کر رہے ہیں وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے یا ناکامیاب اور اگر کامیاب ہوئے تو کس حد تک کامیاب ہوئے؟ ان سوالوں کے فیصلہ کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ جو رپورٹیں ہمیں وہاں سے مل رہی ہیں وہ نہ مایوس کن ہیں اور نہ بہت زیادہ امید افزا ہیں۔ بعض اسکیمیں شروع کر دی گئی ہیں، بعض کے لیے زمین ہموار کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں، بعض ابھی زیر غور ہیں مستقبل فیصلہ کرے گا کہ اس تمام تگ و دو کا حاصل کیا رہا۔ اس وقت تک کی کوششوں کا حاصل صرف یہ ہے کہ ذہین اور سمجھ دار لوگوں کا ایک حلقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو ہماری اسکیم اور ہمارے طریق کار سے پوری طرح متفق ہو چکا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کامیابی بھی کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔ کام کا جو نقشہ ہمارے سامنے ہے وہ کوئی وقتی اور ہنگامی نقشہ نہیں ہے بلکہ اس میں کافی وقت لگے گا اور اس کے لیے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو کامیاب بنانے کے لیے مقامی کارکنوں کی ایک اچھی جماعت پیدا ہو جائے۔ اگر ہماری اس وقت کی جد و جہد کا نتیجہ صرف اتنا ہی نکلے کہ خود بہار کے کارکنوں کی ایک جماعت ہماری اسکیم اور طریق کار کو اپنا لے تو ہم اس نتیجہ پر پوری طرح مطمئن ہیں۔ اس وقت تک ہمارے ہم کو جو اطلاعات ملی ہیں ان کی روشنی میں اس سے زیادہ وہاں کے کاموں اور ان کے نتائج کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ تمام حالات کا صحیح اندازہ وہاں کی آخری رپورٹ سے ہوگا جو انشاء اللہ کام کے ختم ہونے پر شائع کر دی جائے گی۔

مقالات

داعی حق کی ذمہ داری

از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

داعی حق ہو یا داعی ضلالت دونوں میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ نے دعوت اور ترغیب سے زیادہ کسی بات کا اختیار نہیں بخشا ہے۔ نہ پیغمبروں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی شخص کے دل میں ہدایت ڈال دیں اور نہ شیطان ہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی شخص کو گمراہی کی راہ پر لگا دے۔ ان میں سے ہر ایک کو بس یہ اختیار حاصل ہے کہ یہ اپنی اپنی راہ کی طرف خلق خدا کو بلا سکتے ہیں۔ ہدایت یا ضلالت کو اختیار کرنا، اختیار کرنے والے کی اپنی پسند اور اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق یا تیسیر پر منحصر ہے۔ اس توفیق اور تیسیر کے لیے اللہ تعالےٰ نے ایک ضابطہ بنا دیا ہے جس کے مطابق وہ اپنے سلیم الفطرت اور ہدایت پسند بندوں کو نبیوں کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے اور کجروی اور گمراہی کو پسند کرنے والوں کے لیے شیطان کے راستوں پر چلنا آسان کر دیتا ہے۔ یہی حقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان آیات میں واضح کی گئی ہے۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ (قصص)	تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ تعالےٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔
وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ (یوسف)	اور اکثر لوگ، خواہ تم کتنا ہی چاہو، ایمان نہیں لانے کے۔
إِن تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَن يُضِلُّ وَمَا لَهُم مِّن	اگر تم ان کی راہ یابی کے متمنی ہو تو سن رکھو کہ اللہ نہیں راہ یاب کرتا ہے ان لوگوں کو جن کو گمراہ کر دیتا ہے

نَاصِرِينَ | اور الیسوں کا کوئی مددگار نہیں۔

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ (ابراهیم)

یہ کتاب ہے جو ہم نے تم پر اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں میں سے روشنی کی طرف لاؤ ان کے رب کی اجازت سے۔

اسی طرح ابلیس کو خطاب کرکے فرمایا ہے:۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ (الحجر)

میرے بندوں پر تجھکو کوئی قابو حاصل نہیں ہے، صرف ان پر تیرا زور چلے گا جو شریروں میں سے تیری پیروی کریں گے۔

خود ابلیس کی زبان سے اس کا یہ اعتراف نقل کیا ہے:۔

وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ (ابراهیم)

اور مجھکو تم پر کوئی اختیار نہیں ملا تھا مگر یہ کہ میں نے تم کو دعوت دی تو تم نے میری دعوت پر لبیک کہا تو اب مجھکو ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔

اس امر واقعی کی وجہ سے جہاں تک ایک داعی حق کا تعلق ہے وہ اس مسئلہ پر بالکل غور نہیں کرتا اور نہ اسے غور کرنا چاہیے کہ لوگ اس کی دعوت پر کان دھریں گے یا نہیں اور نہ اس فکر میں سر کھپاتا ہے کہ زمانہ اس کی دعوت کے لیے سازگار ہے یا ناسازگار۔ وہ لوگوں کے رد و قبول، اپنی کوششوں کی کامیابی و ناکامی اور دعوت حق کے انجام کے متعلق ایک بار یہ فیصلہ کرکے کہ اس امر کا تعلق اس کی ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے، بالکل مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اس بات پر غور کرتا ہے کہ خود اس کا اپنا فرض کیا ہے اور جب یہ طے کر لیتا ہے کہ اس کا اپنا فرض یہی ہے کہ وہ اس مقصد کی دعوت دے جس کو وہ حق یقین کر رہا ہے اور جو اس کے خیال میں تمام دنیا کے لیے یکساں مفید ہے تو یہ طے کر چکنے کے بعد وہ اس تردد میں نہیں پڑتا کہ لوگ اس دعوت کو قبول کرنے کے بارہ میں اپنا فرض پورا کریں گے یا نہیں اور اللہ تعالیٰ اس دعوت کو دنیا میں برپا کرے گا یا نہیں؟

جہاں تک لوگوں کے رد و قبول کا تعلق ہے وہ اس کی دعوت کو قبول کریں یا نہ کریں دونوں صورتوں میں اس کی اپنی ذمہ داری بدستور قائم رہتی ہے۔ اگر وہ قبول کریں گے تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی اور فلاح کی راہیں کھلیں گی اور یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ادائے فرض دعوت کا اجر دوبارہ حاصل کرے گا۔ اور اگر نہ قبول کریں گے تو اس کے ذریعہ سے لوگوں پر خدا کی حجت پوری ہوگی اور داعی اللہ کے ہاں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش قرار دیا جائے گا کہ اس کا جو فرض تھا اس نے پورا کر دیا۔ قرآن میں داعیانِ حق کی ایک جماعت کا جواب نقل ہوا ہے جن کو ان لوگوں کے سامنے بے فائدہ اپنی دعوت پیش کرنے سے روکا گیا تھا جو دعوت کو قبول کرنے والے نہیں تھے اس جواب سے داعی حق کے فرض کی نوعیت واضح ہوتی ہے کہ لوگ اس کی دعوت کو قبول کریں یا نہ کریں دونوں صورتوں میں اس کا فرض صرف حق کی دعوت دینا ہے۔ اگر لوگ قبول کریں گے تو ہدایت پائیں گے اور اگر نہ قبول کریں گے تو یہ اللہ کے ہاں بری الذمہ قرار پائے گا۔

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (۱۶۴ - الاعراف)

اور جب کہا ان میں سے ایک جماعت نے کہ ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو یا تو اللہ تعالیٰ ہلاک کرنیوالا ہے یا کم از کم سخت عذاب دینے والا ہے انھوں نے جواب دیا کہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمارا عذر واضح

باقی رہا اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا معاملہ تو مجرد یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اس حق کو واضح کیا ہے اس کے دل کے اندر یہ اطمینان پیدا کرتی ہے کہ اس حق کی دعوت دینا، لوگوں کے لیے اس کا قبول کرنا اور دنیا میں اس کا فروغ پانا ممکن ہے اور اگر وہ اس کی طرف لوگوں کو بلانے اور دنیا میں اس کو برپا کرنے کا عزم لے کر اٹھے گا تو اللہ ضرور اس کام میں اس کی امداد فرمائے گا۔ ایک رحیم و کریم خدا کے متعلق وہ یہ بدگمانی نہیں کر سکتا کہ جس راستہ کی طرف وہ رہبری فرمائے کہ یہ صراطِ مستقیم ہے اس راستہ پر چلنا ناممکن ہو اور جس نظامِ زندگی کے بابت فرمائے کہ یہ فطری نظامِ زندگی ہے وہ اتنا پیچیدہ اور ناممکن العمل ہو کہ لوگ اس کو اختیار ہی نہ کر سکیں۔ نیز ایک عادل اور مہربان پروردگار کے متعلق وہ یہ بدگمانی بھی نہیں کر سکتا

کہ وہ اس پر ایک فرض عائد کرکے یہ حکم دے کہ تیرے کرنے کا کام یہ ہے اور اسی کے کرنے میں تیری نجات اور میری خوشنودی ہے لیکن جب وہ اس کو کرنا شروع کرے اور اس کے سامنے مشکلیں آئیں تو وہ اس کو تنہا بے یار و مددگار چھوڑ دے اور اس کی کوئی مدد نہ فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ حسن ظن اور یہ اعتماد ہر داعی حق کے اندر موجود ہوتا ہے اور مخالفین جب اس کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کرتے ہیں اور بظاہر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ کام اب آگے نہیں بڑھنے کا ہے تو یہی اعتماد اس کی ڈھارس بندھاتا ہے کہ جس راستہ کی طرف خود خدا نے انگلی اٹھا کر اشارہ فرمایا ہے کہ راہ حق یہ ہے تو اس پر چلنے والا منزلِ مقصود تک ضرور پہنچ کے رہے گا اور اس راہ میں خواہ کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں لیکن بالآخر اللہ کی مدد ضرور آکے رہے گی۔

داعیانِ حق کا یہی حسن ظن اور اعتماد ہے جو سورہ ابراہیم کی اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے:-

وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ (ابراہیم)

اور کیوں نہ ہم اعتماد کریں اللہ پر جبکہ اس نے خود ہم پر ہماری راہیں کھولی ہیں اور ہم صبر کریں گے ان تکلیفوں پر جو تم ہمیں پہنچاؤ گے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ بھروسہ کرنے والے

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی اپنی ذمہ داری کے حدود متعین کرنے میں غلطی کر جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس پر صرف اسی حد تک ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ حق کو لوگوں تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دے بلکہ وہ اس بات کا بھی ذمہ دار ہے کہ لوگ اس حق کو قبول بھی کرلیں۔ اس غلطی کا لازمی نتیجہ ایک تو یہ ہوتا ہے کہ داعی کے اندر، حق خالص کو پیش کرنے کے بجائے، مخالفین کے باطل عقائد و افکار کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے اور دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بالکل غلط ذمہ داری اپنے سر تھا لینے کی وجہ سے اپنی زندگی سخت افکار اور الجھنوں میں ڈال دیتا ہے۔ اس طرح کی غلطیوں سے بچانے کے لیے قرآن مجید نے مفصل ہدایات دی ہیں۔ مثلاً:

وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَٰكِنْ ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ

ان لوگوں سے جو خدا سے ڈرتے ہیں ان لوگوں کے اعمال کی پرسش نہ ہوگی جو خدا سے نہیں ڈرتے بلکہ (ان لوگوں کی ذمہ داری) صرف یاد دہانی کر دینا ہے تاکہ وہ ڈریں۔

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ	تو پیروی کر اس چیز کی جو تیرے اوپر خدا کی طرف سے
لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ	اتاری جا رہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے
وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا وَ مَا جَعَلۡنٰکَ	اور مشرکوں سے اعراض کر۔ اگر اللہ چاہتا کہ یہ مشرکین
عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ (انعام)	شرک نہ کرنے پائیں تو یہ شرک نہ کر سکتے (لیکن اللہ تعالیٰ نے

دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں کی ہے) اور ہم نے تم کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے (کہ یہ کوئی غلطی کر ہی نہ سکیں) اور نہ تم ان پر وکیل بنا کر بھیجے گئے ہو (کہ ان کے ایمان کے معاملہ کی ذمہ داری تم پر ہو)۔

فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا	تمھارے اوپر صرف پوری طرح پہنچا دینے کی ذمہ داری
الۡحِسَابُ (رعد)	ہے حساب کی ذمہ داری ہم پر ہے۔
طٰہٰ، مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ	ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ تم اپنی زندگی
لِتَشۡقٰۤی اِلَّا تَذۡکِرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی	مصیبت میں ڈال لو۔ یہ تو یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں

اس زمانہ میں جو لوگ طاغوت کے عالمگیر تسلط کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، اور دعوتِ حق کا کوئی امکان نہیں پا رہے ہیں یا دعوت حق کے پھیلنے کا امکان نہ پا کر دعوت باطل ہی میں لگ گئے ہیں یہ لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ ان لوگوں کے سامنے اگر یہ حقیقت واضح ہوتی کہ ان کی ذمہ داری صرف بلاغ ہے۔ لوگوں کا ان کی پیش کی ہوئی دعوت کو قبول کرنا یا نہ کرنا اور اس دعوت کا فروغ پانا یا نہ پانا ان سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے تو نہ وہ امکان اور عدم امکان کی الجھنوں میں پڑتے اور نہ وہ ایک باطل کو برپا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتے بلکہ اپنے بس بھر حق کی دعوت دیتے اور اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے کہ جب وہ خود حق ہے اور حق کو دوست رکھتا ہے تو اس حق کو ضرور برپا کرے گا جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری بھی اپنے کاندھوں پر اٹھا لینی چاہی، اور جب انھیں اندازہ ہوا کہ یہ بوجھ بھاری ہے ان سے نہیں اٹھ سکے گا تو مجبوراً ان کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہر چند خیر و برکت والا نظام تو وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے لیکن اس زمانہ میں اس کا وسیع پیمانہ پر قیام چونکہ ناممکن ہے اس وجہ سے اس کے

سوا چارہ نہیں کہ ایک غیر اسلامی نظام کی دعوت دی جائے۔

اس خیال کے اندر جو گمراہیاں چھپی ہوئی ہیں ان سب کو نہ ظاہر کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ان کے ظاہر کرنے کی یہاں گنجائش ہے البتہ صرف ایک بات کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان حضرات نے دیدہ دانستہ حق کی راہ چھوڑ کر باطل کی راہ محض اس خیال سے اختیار کی کہ اس راہ پر چل کر وہ آسانی سے اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ حالانکہ اس راہ میں بھی کامیابی (جس کو وہ کامیابی سمجھتے ہیں) اگر حاصل ہوگی تو اللہ کے حکم ہی سے حاصل ہوگی نہ کہ خود ان کی سعی و تدبیر سے۔ تو بجائے اس کے کہ وہ ایک باطل راہ پر چل کر اس بات کا انتظار کرتے کہ اللہ تعالیٰ اس راہ میں ان کی رسی دراز کرے کیا یہ بہتر نہ تھا کہ خود بھی راہ حق پر چلتے، اور اسی پر چلنے کی دوسروں کو بھی دعوت دیتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق اور کامیابی کے منتظر رہتے؟

بہر حال یہ خطرناک غلطی جس نے ان کی ساری جدوجہد کو ایک بالکل غلط راہ پر لگا دیا صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ بحیثیت داعی انھوں نے اپنی ذمہ داری کے حدود کو ٹھیک ٹھیک معین نہیں کیا۔ انھوں نے اپنا فرض صرف اسی قدر نہیں سمجھا کہ جس حق کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کی ہے اس حق کو بلا کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیں بلکہ اپنا فرض یہ بھی سمجھا کہ کوئی ایسی چیز لوگوں کے سامنے پیش کریں جو زمانہ کے رجحانات کے مطابق ہو اور جس کو لوگ آسانی سے قبول کرلیں۔ یہ غلطی لازمی طور پر ایک داعی کو رحمان کے راستہ سے ہٹا کر شیطان کے راستہ پر ڈال دیتی ہے اور وہ صرف داعی ہی نہیں رہ جاتا بلکہ مدعی بن کر خدا کے حقوق میں دراندازی کرنے والا اور ایک نیا دین پیش کرنے والا بن جاتا ہے۔

ایک داعی اگر اپنی اس حیثیت کو اچھی طرح پہچانتا ہے تو اس سے اس بات کا اندیشہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ مایوس اور بے دل ہو کر بیٹھ رہے یا حق کی جگہ باطل ہی کی دعوت شروع کر دے البتہ اس کو اس پہلو سے اپنی نگرانی کرنی پڑتی ہے کہ کہیں اس خیال کی وجہ سے کہ اس کے اوپر صرف بلاغ کی ذمہ داری ہے، اس کے اندر بے پروائی اور سہل انگاری نہ پیدا ہو جائے۔ اس کو ہمیشہ

ان ذمہ داریوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے جو داعی پر بحیثیت داعی عائد ہوتی ہیں اور جن کا لحاظ نہ رکھنے کی صورت میں ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس سے مواخذہ ہو جائے کہ اس نے تبلیغ یا ادائے شہادت کا فرض اس طرح ادا نہیں کیا جس طرح اس کو ادا کرنے کا حق تھا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا جہاں تک تعلق ہے ان کو فرض رسالت کی ذمہ داریوں کا اس درجہ شدید احساس ہوتا تھا کہ وہ بسا اوقات اس کے پیچھے نہ اپنے ضروری آرام کا خیال کرتے نہ اپنی اور اپنی دعوت کی عزت و شان کا بلکہ ان کے غیر معمولی انہماک سے ایسا ظاہر ہوتا کہ گویا وہ اپنے آپ کو لوگوں کے کفر و ایمان کا ذمہ دار سمجھ رہے ہیں۔ اس انہماک پر اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو محبت آمیز انداز میں ٹوکا ہے جس کی بعض مثالیں ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ یہی انہماک، افراط و تفریط سے بچ کر، ہر داعی حق کی خصوصیت ہونا چاہیے۔

خریداران ترجمان القرآن سے التماس

(۱) چندہ کے منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ صاف اور خوشخط لکھیے۔ (خصوصاً ڈاک خانہ اور ضلع کا نام انگریزی کے بڑے حروف میں درج کیجیے)۔ سابق نمبر خریداری بھی تحریر فرمائیے۔

(۲) تبدیلیٔ پتہ کی فرمائش مہینہ کی ۵ تاریخ تک دفتر کو پہنچ جانی چاہیے جس میں پہلا پتہ اور نیا تبدیل شدہ پتہ دونوں نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ درج ہوں۔

(۳) بمبئی، بنگال، جنوبی ہند، بہار، سی پی اور وسط ہند کے خریدار حضرات اپنا پتہ لازماً انگریزی میں لکھا کریں۔

(۴) اجرائے رسالے کے لیے پیشگی چندہ بھیجیے یا وی پی کی اجازت دیجیے۔ قرض یا وعدہ پر رسالہ جاری نہیں کیا جاتا۔

اگر خدانخواستہ آپ ان گذارشات کو نظر انداز کریں گے تو دفتر کی مجبورانہ کوتاہیوں کی ذمہ داری آپ پر ہو گی۔

"منیجر"

دعوت اسلامی اور اس کے محرکات

[یہ وہ تقریر ہے جو جماعت اسلامی کے اجتماع الہ آباد میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے جلسۂ عام کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی]

خطبۂ مسنونہ کے بعد:-

حاضرین! مجھے اس وقت آپ کے سامنے کوئی لمبی تقریر نہیں کرنی ہے۔ پچھلے دو تین دنوں کے اندر میں بار بار آپ کے سامنے اپنے خیالات پیش کر چکا ہوں۔ اس وقت کی اصلی تقریر امیر جماعت کی تقریر ہوگی۔ میں محض تعمیل حکم میں یہاں آ گیا ہوں اور مختصراً صرف یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ ہم کیا دعوت لے کر اٹھے ہیں اور اس دعوت کو لے کر اٹھنے کے محرکات و اسباب کیا ہیں۔

بحیثیت ایک انسان اور ایک سوچنے والی ہستی کے جب ہم اس دنیا کے حالات پر غور کرتے ہیں اور یہ معین کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں ہمارا پوزیشن کیا ہے۔ ہم خالق ہیں یا مخلوق، آزاد ہیں یا محکوم ذمہ دار اور مسئول ہیں یا مطلق العنان اور غیر مسئول؟ نیز اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ ہمیں کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے، ہمارا نظام اخلاق کیا ہونا چاہیے، ہمارے لیے معاشرت و معیشت اور سیاست و اجتماع کے پسندیدہ ضابطے کیا ہیں؟ تو سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ دنیا محض اتفاق سے وجود میں نہیں آ گئی ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک حکیم ارادہ کارفرما ہے۔ نیز یہ کہ یہ یونہی کوئی اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ اس کے ہر گوشہ میں حکمت اور مقصد کی جلوہ گری ہے۔ ہم اس کے اندر تدبیر و حکمت کی اتنی کارفرمائیاں دیکھتے ہیں کہ یہ باور نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ بغیر کسی مدبر کے ہو رہا ہے۔ ہم ربوبیت اور پروردگاری کے اتنے مظاہر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ بغیر کسی رب اور پروردگار کے وجود میں آ سکتا ہے۔ یہاں ہر قدم پر قدرت اور حکمت کی اتنی گل کاریاں

موجود ہیں کہ ہر بات کا انکار ممکن ہے لیکن اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب کچھ ایک زبردست کاریگر کی کاریگری اور ایک ماہر صناع کی صنعت گری کا کرشمہ ہے۔

اس سارے ہنگامۂ وجود کے پیچھے ایک حکیم، ایک قدیر، ایک قیوم، ایک پروردگار اور ایک مہربان خدا کو مان لینے کے بعد دوسری حقیقت ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے جس کی قدرت و حکمت کی یہ ساری گل کاریاں ہیں جس کی پروردگاری اور جس کی رحمانیت کے اتنے بے شمار آثار ہر گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں جس نے انسان کو اتنی اعلیٰ قابلیتوں اور صلاحیتوں سے آراستہ کیا ہے، ہو نہیں سکتا کہ اس نے انسان کی عقلی و اخلاقی رہنمائی کے لیے اور زندگی کو ٹھیک ٹھیک گذارنے کے لیے کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہ بتایا ہو۔ ضرور اس نے اس کی عقلی و اخلاقی زندگی کا بھی اسی طرح سامان کیا ہوگا جس طرح اس کی مادی زندگی کی ضرورتوں کا سامان کیا ہے۔ ہماری عقل ہمیں بتاتی ہے کہ ایسا ہونا چاہیے۔ آسمان و زمین کے اندر جو انتظام ہے وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور انسان کی فطرت جس ساخت پر بنی ہے وہ اپنی بناوٹ ہی سے اس کے لیے مطالبہ کر رہی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس چیز کو دل مانگ رہا ہے اور جس کے لیے عقل تقاضا کر رہی ہے واقعہ کی شکل میں بھی اس کے موجود ہونے کی کوئی شہادت موجود ہے یا نہیں؟ جب ہم معاملہ پر اس پہلو سے غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے انسانوں کی ایک ایسی جماعت آتی ہے جو ــــ سب کے سب بہترین اخلاق و سیرت کے لوگ ہیں، جو ذہنی و اخلاقی اعتبار سے اپنے زمانہ کی سوسائٹی کے گل سر سبد ہیں، جن کے دوستوں نے ہر معاملہ میں ان پر اعتماد کیا اور کبھی اپنے اس اعتماد میں دھوکا نہیں کھایا، جن کے دشمنوں نے ہمیشہ ان کی لغزشوں کی جستجو کرنی چاہی لیکن کبھی ان کی کسی کمزوری یا لغزش پر گرفت نہ کر سکے ــــ یہ سب کے سب بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے قانون نازل کیا ہے۔ وہ قانون انھوں نے دنیا کے سامنے پیش بھی کیا اور اپنے اپنے زمانوں میں اس کو دنیا میں جاری کر کے اس کی افادیت کو اچھی طرح آشکارا بھی کیا۔ تجربہ سے یہ قانون بہترین ثابت ہوا ہے۔ غور کرنے والے اس کی خوبیوں اور باریکیوں پر عش عش کرتے ہیں

دیکھنے والے اس کی برکتوں اور اس کے فوائد پر سر دھنتے ہیں۔ اس قانون کے ذریعہ سے بہترین نظام عدل و انصاف قائم ہوا، بہترین طریقہ پر اس سے لوگوں کے معاملات اور حقوق کے جھگڑے چکائے گئے، سوسائٹی کے ہر طبقہ کو اس سے امن و اطمینان حاصل ہوا، معاشرت اور معیشت کے ہر گوشہ میں خیر و برکت پھیلی۔

یہ حقیقت واضح ہونے کے بعد لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کا بھیجا ہوا قانون اور اس کا بتایا ہوا نظام زندگی دنیا میں موجود ہے تو کیا انسانوں کے لیے، جو خدا کی مخلوق ہیں، یہ بات جائز ہو سکتی ہے کہ اس کے قانون کے سوا کسی اور قانون کی اطاعت تسلیم کریں اور اس کے بتائے ہوئے نظام زندگی کے سوا اپنے لیے کوئی اور نظام زندگی اختیار کریں۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ قانون اور وہ نظام زندگی خود ان کا بنایا ہوا ہو یا کسی اور کا اور وہ قانون ان کے خیال میں بہتر ہو یا بدتر۔ مجرد اس سوال کا جواب دیجیے کہ خدائی قانون کی موجودگی میں ایک لحظہ کے لیے بھی یہ بات جائز ہو سکتی ہے کہ اس قانون کو چھوڑ کر کسی اور قانون کی اطاعت و پیروی کی جائے؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا سیدھا اور صاف جواب صرف ایک ہی ہے کہ نہیں! جو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں ان کے لیے یہ بات کسی حال میں جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ خدا کے قانون کے سوا، جب کہ وہ ان کے پاس موجود ہو چھوڑ کر کسی اور قانون کی پیروی کریں۔ یہ ناشکری ہے، نمک حرامی ہے ظلم عظیم ہے، بلکہ شرک اور خدا سے صریح بغاوت ہے جس کے ارتکاب کی جرأت وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی فطرت نہ تو دنیا میں کسی بڑی سے بڑی ناانصافی سے جھجکتی ہو اور نہ وہ آخرت میں کسی بڑی سے بڑی سزا سے ڈرتے ہوں۔

ہماری دعوت کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔ ہم تمام بنی آدم کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ اللہ ہی کی بندگی اور اطاعت کرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے نبیوں اور رسولوں کے دیے ہوئے قانون کو مانو۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے انسانوں کو اپنی مرضی اور اپنے احکام سے مطلع کرتا رہا ہے اور ہر قوم میں اس کے احکام اور قوانین کو بتانے والے لوگ آتے

ہیں لیکن قوموں نے تھوڑے تھوڑے زمانوں کے بعد اپنی غفلتوں اور کمزوریوں کی وجہ سے اپنے نبیوں کی بتائی ہوئی باتیں کچھ تو بھلا دیں اور کچھ ان میں اپنی خواہش کے مطابق دوسری باتیں ملا دیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے سب سے آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالم کے لیے ہادی و رہبر بنا کر بھیجا اور آپ کے ذریعہ ایک طرف تو تمام پچھلے نبیوں کی تعلیم کو زندہ کر دیا اور دوسری طرف اپنے دین کو کامل کر دیا۔ ہم نے اس پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر غور کیا ہے اور ہم پوری طرح مطمئن ہیں کہ آپ کی تعلیم تمام گذشتہ نبیوں کی تعلیم کا سچا مجموعہ بھی ہے اور خدا کے دین کی تکمیل بھی ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ تقلیدی نہیں ہے بلکہ ہم نے پوری آزادی کے ساتھ، خالص عقل کی روشنی میں اسلام پر غور کیا ہے اور غور کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں اور اب ساری دنیا کے سامنے اس دعوت کو پیش کر رہے ہیں۔

ہمارے بہت سے غیر مسلم بھائی ہماری اس رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن یہ مطالبہ ہم ان سے ضرور کریں گے کہ دین کا معاملہ کوئی آسان معاملہ نہیں ہے اس وجہ سے ان کا فرض ہے کہ وہ اسلام پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔ مختلف اسباب سے ان کے اور مسلمانوں کے درمیان جو تعصبات حائل ہو گئے ہیں ان کو اسلام پر غور کرنے کی راہ میں ہرگز حائل نہ ہونا چاہیے۔ اسلام کوئی تنہا مسلمانوں کا دین نہیں ہے۔ یہ تمام دنیا کا دین ہے اور دنیا کے تمام نبیوں کی لائی ہوئی سچائیاں اس کے اندر جمع ہیں اس وجہ سے اگر کوئی قوم مسلمانوں کے ساتھ تعصب کی وجہ سے نفس اسلام کو قابل نفرت سمجھنے لگے گی اور اس پر غور کرنے سے انکار کر دے گی تو وہ برائے شگون پر اپنی ناک کاٹ لے گی۔

اگر ہمارے غیر مسلم بھائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ تعصب کی وجہ سے نفس اسلام پر غور کرنا چھوڑ دیا تو اس سے نہ تو مسلمانوں کو کچھ نقصان پہنچے گا نہ اسلام کو بلکہ سرتاسر خود ان کو نقصان پہنچے گا کہ اللہ کی جو نعمت ہوا، پانی اور روشنی کی طرح ان کے لیے بھی اسی طرح عام تھی جس طرح مسلمانوں کے لیے اس سے وہ اپنے تعصبات کی وجہ سے محروم رہے۔

ہم ان لوگوں کے لیے۔ جو اسلام کو ہر طرح کے تعصبات سے آزاد ہو کر سمجھنا چاہیں، صالح لٹریچر تیار کر رہے ہیں اور ہم کو دلی خوشی ہوگی اگر ہم اس سلسلہ میں ان طالبان حق کی کوئی خدمت

کر سکیں جو ہمارے غیر مسلم بھائیوں کے اندر سے اسلام کو سمجھنے کے لیے اٹھیں۔

اس موقع پر ہم مسلمانوں کے سامنے بھی یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے دین کو اپنی قومی میراث نہ بنائیں۔ اسلام کے ساتھ اسی شخص کا تعلق واقعی تعلق ہے جو اس کے عقائد پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے حکموں پر عمل کرتا ہے۔ محض مسلمان گھر میں پیدا ہو جانے سے کوئی شخص مسلمان نہیں بن جاتا۔ مسلمانوں کی اس غلطی نے اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اس کے سبب سے وہ خود بھی اسلام کی برکتوں سے محروم ہوئے اور دوسروں کو بھی اس سے بدگمان کر رہے ہیں۔ وہ ایک خدائی جماعت کی جگہ جب ایک قوم بن کر دنیا کے سامنے آتے ہیں تو اسلام کی دعوت ان کی زبان سے کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ وہ یا تو حقیقی مسلم بنیں یا پھر مسلمان قوم ہی بن کر رہیں۔ ایک قوم اور ایک اصولی جماعت کی دو بالکل متبائن خصوصیات اپنے اندر جمع کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس شترگربگی نے ان کو کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ نہ وہ دین کے کام کے رہے اور نہ دنیا ہی کے کام کے رہے۔ اگر فی الواقع ایک اسلامی جماعت ہیں تو ان کو چاہیے کہ وہ اپنی ساری وابستگی اسلام کے اصولوں کے ساتھ ظاہر کریں اور ان تمام مطالبات سے دستکش ہو جائیں جو انھوں نے قومی خصوصیات کے ماتحت پیدا کیے ہیں۔ اس شترگربگی نے ان کا پوزیشن بہت خراب کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے انھوں نے غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کے خلاف سخت تعصبات پیدا کر دیے ہیں۔ دوسری قوموں نے اسلام کے احکام و قوانین پر اس وجہ سے غور کرنا چھوڑ دیا کہ ایک خاص قوم کا دین ہے جو نسل اور تہذیب اور دوسری قومی خصوصیات میں ان سے بالکل مختلف حیثیت رکھتی ہے۔

موجودہ مسلمانوں کی اسی شترگربگی نے ہم کو مجبور کیا کہ ہم ایک ایسی جماعت بنائیں جس کی ساری وابستگی خالص اسلام کے اصولوں کے ساتھ ہو۔ وہ ہر طرح کے نسلی، قومی اور وطنی تعصبات سے بالاتر ہو۔ وہ خدا کی زمین میں خدا کے دین کی اپنے قول اور عمل دونوں سے شہادت دے۔ ہم نے اس طرح کی جماعت بنا کر اپنا یہ فرض سمجھا ہے کہ ہم نے جس دین کو حق پایا ہے اس دین کو سب سے پہلے اس ملک کے باشندوں کے سامنے پیش کریں جس ملک میں ہم پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ہم کسی

خود غرضی سے نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنا ایک فرض ادا کر رہے ہیں اور اس کا محرک وہ محبت ہے جو ہم وطنی کے رشتہ کی وجہ سے ہمیں اس ملک کے ہر باشندے سے ہونی چاہیے اور ہے۔

یہ زمانہ ہزاروں برائیوں کے ساتھ اپنے اندر ایک خوبی بھی رکھتا ہے کہ اس زمانہ میں تقلید جامد کا زور بہت کم ہو گیا ہے۔ لوگ آزادی کے ساتھ ہر طرح کے خیالات پر غور کرنے لگے ہیں اور مجرد ان خیالات کی خوبی یا کمزوری کی بنا پر ان کے حسن و قبح کا فیصلہ کرنے لگے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اسی آزادی اور بے تعصبی کے ساتھ لوگ اسلام پر بھی غور کریں گے۔ اگر لوگوں نے ایسا کیا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی ساری مشکلات کا بہترین حل اسلام میں پائیں گے۔

اس زمانہ میں دنیا کا مزاج پوری شدت کے ساتھ اس بات کا مطالبہ کر رہا ہے کہ قومی تعصبات اور نسلی و وطنی تنگ نظریوں کو چھوڑ کر سیاست و تمدن کی بنیاد ایسے عالمگیر اصولوں پر رکھی جائے جو تمام نسل انسانی کو ایک نقطہ پر جمع کر سکیں۔ یہ مطالبہ اس دنیا کا فطری مطالبہ ہے اور ضروری ہے کہ یہ پورا ہو۔ اگر یہ پورا نہ ہوا اور دنیا کو ایسے عالمگیر اصول نہ مل سکے جن پر تمام دنیا متفق ہو سکے تو اس کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی تباہی ہے۔ یہ زمانہ الگ الگ قومی حکومتوں کا زمانہ نہیں ہے اور نہ اس کا زمانہ ہے کہ کوئی ایک قوم ساری دنیا پر یا دنیا کے بڑے حصہ پر حکومت کر سکے۔ جب تک یہ چیزیں باقی ہیں اسی طرح کی ہولناک تباہیاں اس دنیا پر آتی رہیں گی جس طرح کی ہولناک تباہی کے تماشے ابھی ابھی آپ دیکھ چکے ہیں۔ ان ساری مشکلوں کا علاج بس وہی ہے جو اسلام پیش کرتا ہے یعنی یہ کہ انسان انسانوں پر حکومت نہ کرے بلکہ خدا انسانوں پر حکومت کرے اور دنیا کے سارے انسان صرف اس احکم الحاکمین کے قانون کی پیروی کریں جو اس سارے جہان کا حقیقی اور جائز بادشاہ ہے۔

اسلام نے ہمارے لیے جو نظام زندگی پیش کیا ہے اس کے بنیادی اصول دو ہیں۔ ایک وحدت الٰہ دوسرے وحدت انسانیت۔ اور اگر غور کیجیے تو کوئی عالمگیر نظام حقیقی وجود میں نہیں آ سکتا جب تک ساری قومیں ان دونوں حقیقتوں کو تسلیم نہ کر لیں۔ جب تک آپ خالص توحید کا عقیدہ مختلف خداؤں کے وجود سے قوم و زبان کو نشانہ دے اور سب لوگ ایک ہی آدم کی اولاد کی حیثیت سے

ایک ہی خدا کے اتارے ہوئے قانون کو ان لیں یہ دنیا بے شمار ... وں کی رزمگاہ اور مختلف دعیوں کی معرکہ گاہ بنی رہے گی۔ کالے اور گورے کا فرق باقی رہے گا۔ شریف اور وضیع میں امتیاز قائم رہے گا۔ اور عربی وعجمی آپس میں لڑتے رہیں گے۔ ان دونوں اصولوں کو تسلیم کر لینے کے بعد ساری جنگیں ختم ہو جائیں گی۔ تمام دنیا کے انسان ایک خدا کے محکوم اور آپس میں بھائی بھائی بن جائیں گے۔ اور ان تمام بھائیوں میں کوئی فرق و امتیاز جائز نہ ہوگا الا بدین او تقویٰ ___ یعنی اس نظام میں صرف ان لوگوں کو ترجیح حاصل ہوگی جو خدا کے قانون کی زیادہ سے زیادہ اطاعت کرنے والے اور بنی آدم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انصاف اور بھلائی کرنے والے ہوں۔ ان لوگوں کو اس نظام میں کوئی درجہ حاصل نہ ہوگا جو زمین میں فساد کرنے والے اور اپنی برتری اور خدائی کے دعوے کرتے ہوں۔ ان باتوں کو باور کرنے میں اگر آپ کو کچھ تردد ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اسلام پر براہ راست غور کرنے کی کبھی زحمت نہیں اٹھائی ہے بلکہ اس کو صرف مسلمانوں کے ذریعہ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپ ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں۔ ہر مسلک زندگی کو لوگ اس کے نام لینے والوں ہی کے واسطے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ اسلام کے بارہ میں یہ طریقہ مسلمانوں کی غلط روی کی وجہ سے نہایت غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اگر آپ اسلام کی اصلی صورت دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی شکل صرف ایک ہی ہے کہ آپ اسلام پر براہ راست غور کریں۔ اگر آپ اس حیثیت سے غور کریں گے تو ہم کو یقین ہے کہ آپ اس کو دنیا کے تمام آزمائے ہوئے نظاموں سے کہیں زیادہ بہتر پائیں گے۔ وہ خدا کے بھیجے ہوئے تمام نبیوں کی پاک تعلیمات کا محفوظ ترین مجموعہ ہے۔ وہ خدا کے آخری رسول کا لایا ہوا آخری اور کامل دین ہے۔ وہ ایک اجتماعی اور سیاسی نظام کی حیثیت سے تھیوکریسی، ڈیموکریسی اور ارسٹوکریسی کی تمام خوبیوں کا مجموعہ اور ان کی تمام کمزوریوں اور خرابیوں سے بالکل پاک ہے۔ یہ اپنے نظام کو چلانے کے لیے بہترین سیرت کے آدمی خود تیار کرتا ہے اور انسان سازی کی یہ مشین بھی اس کے سسٹم کا ایک جزو ہے جو اس صورت میں خود بخود اپنا فرض انجام دیتی ہے جبکہ اس کے

مجموعی سسٹم میں کوئی خرابی نہ پیدا کر دی گئی ہو۔

حضرات! اب میں اپنی اس تقریر کو ختم کرتا ہوں اور آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ اگر آپ میں سے کچھ لوگ اسلام پر ایک نظام زندگی کی حیثیت سے غور کرنا چاہیں تو ان کی مدد کے لیے ہماری خدمات حاضر ہیں۔ آخر میں مسلمانوں سے ہماری یہ درخواست ہے کہ وہ للہ اپنی اس تنزگرگی کو چھوڑیں اور اسلام کو یا تو جس طرح اختیار کرنا چاہیے اس طرح اختیار کریں یا کم از کم اس کی راہ میں پتھر نہ بنیں۔ اسی طرح غیر مسلم بھائیوں سے ہماری گذارش ہے کہ وہ پرانے جھگڑوں کی وجہ سے اسلام کے خلاف کسی تعصب میں مبتلا نہ ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر کریں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔

شہادتِ حق

امتِ مسلمہ کا فرض اور مقصدِ وجود

(۲)

حضرات! یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں کرنا کیا چاہیے تھا اور ہم کر کیا رہے ہیں، اور یہ کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کا خمیازہ کیا بھگت رہے ہیں۔ اس پہلو سے اگر آپ حقیقتِ معاملہ پر نگاہ ڈالیں گے تو یہ بات خود ہی آپ پر کھل جائے گی کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں جن مسائل کو اپنی قومی زندگی کے اصل مسائل سمجھ رکھا ہے اور جنھیں حل کرنے کے لیے وہ کچھ اپنے ذہن سے گھڑی ہوئی اور زیادہ تر دوسروں سے سیکھی ہوئی تدبیروں پر اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، فی الواقع ان میں سے کوئی بھی ان کا اصل مسئلہ نہیں ہے، اور ان کے حل کی تدبیروں میں وقت، قوت اور مال کا یہ سارا صرفہ محض ایک زیاں کاری ہے۔ یہ سوالات کہ کوئی اقلیت ایک غالب اکثریت کے درمیان رہتے ہوئے اپنے وجود اور مفاد اور حقوق کو کیسے محفوظ رکھے، اور کوئی اکثریت اپنے حدود میں وہ اقتدار کیسے حاصل کرے جو اکثریت میں ہونے کی بنا پر اسے ملنا چاہیے، اور ایک محکوم قوم کسی غالب قوم کے تسلط سے کس طرح آزاد ہو، اور ایک کمزور قوم کسی طاقتور قوم کی دست بردسے اپنے آپ کو کس طرح بچائے، اور ایک پس ماندہ قوم وہ ترقی، خوشحالی اور طاقت کیسے حاصل کرے جو دنیا کی زور آور قوموں کو حاصل ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے مسائل غیر مسلموں کے لیے تو ضرور اہم ترین اور مقدم ترین مسائل ہو سکتے ہیں، اور ان کی تمام توجہات اور کوششوں کے مرکز و محور قرار پا سکتے ہیں، مگر ہم مسلمانوں کے لیے یہ بجائے خود مستقل مسائل نہیں ہیں بلکہ محض اُس غفلت

کے شاخسانے ہیں جو ہم اپنے اصل کام سے ہٹنے سے بنے ہیں اور آج تک برتتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم نے وہ کام کیا ہوتا تو آج اتنے بہت سے پیچیدہ اور پریشان کن مسائل کا یہ جنگل ہمارے لیے پیدا ہی نہ ہوتا اور اگر اب بھی ہم اس جنگل کو کاٹنے میں اپنی قوتیں صرف کرنے کے بجائے اپنی ساری توجہ اور سعی اس کام مبذول کر دیں تو دیکھتے دیکھتے نہ صرف ہمارے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے پریشان کن مسئلوں کا یہ جنگل خود بخود صاف ہو جائے۔ کیونکہ دنیا کی صفائی و اصلاح کے ذمہ دار ہم تھے، ہم نے اپنا فرض منصبی ادا کرنا چھوڑا تو دنیا خاردار جنگلوں سے بھر گئی اور ان کا سب سے زیادہ پرخار حصہ ہمارے نصیب میں لکھا گیا۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی پیشوا اور سیاسی رہنما اس معاملہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور ہر جگہ ان کو یہی باور کراتے جا رہے ہیں کہ تمہارے اصل مسائل وہی اقلیت و اکثریت، اور آزادیٔ وطن، اور تحفظ قوم اور مادی ترقی کے مسائل ہیں۔ نیز یہ حضرات ان مسائل کے حل کی تدبیریں بھی مسلمانوں کو وہی کچھ بتا رہے ہیں جو انھوں نے غیر مسلموں سے سیکھی ہیں۔ لیکن میں جتنا خدا کی ہستی پر یقین رکھتا ہوں اتنا ہی مجھے اس بات پر بھی یقین ہے کہ یہ آپ کی بالکل غلط رہنمائی کی جا رہی ہے اور ان راہوں پر چل کر آپ کبھی اپنی فلاح کی منزل کو نہ پہنچ سکیں گے۔ میں آپ کا سخت بدخواہ ہونگا اگر ہر لاگ لپیٹ کے بغیر آپ کو صاف صاف نہ بتا دوں کہ آپ کی زندگی کا اصل مسئلہ کیا ہے۔

میرے علم میں آپ کا حال اور آپ کا مستقبل معلق ہے اس سوال پر کہ آپ اس ہدایت کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں جو آپ کو خدا کے رسول کی معرفت پہنچی ہے۔ جس کی نسبت سے آپ کو مسلمان کہا جاتا ہے اور جس کے تعلق سے آپ ——— خواہ چاہیں یا نہ چاہیں ——— بہرحال دنیا میں اسلام کے نمائندے قرار پاتے ہیں۔ اگر آپ اس کی صحیح پیروی کریں اور اپنے قول و عمل سے اس کی سچی شہادت دیں اور آپ کے اجتماعی کردار میں پورے اسلام کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ ہونے لگے تو آپ دنیا میں سربلند اور آخرت میں سرخرو ہو کر رہیں گے۔ خوف اور حزن، ذلت اور مسکنت، مغلوبی اور محکومی کے یہ سیاہ بادل جو آپ پر چھائے ہوئے ہیں چند سال کے اندر چھٹ جائیں گے۔ آپ کی دعوت حق اور سیرت صالحہ دلوں اور دماغوں کو مسخر کرتی چلی جائے گی۔ آپ کی ساکھ اور دھاک دنیا پر بیٹھتی چلی جائے گی

انصاف کی امیدیں آپ سے وابستہ کی جائیں گی، بھروسہ آپ کی امانت اور دیانت پر کیا جائے گا، سند آپ کے قول کی لائی جائے گی، بھلائی کی توقعات آپ سے باندھی جائیں گی، ائمۂ کفر کی کوئی سا کھ آپ کے مقابلہ میں باقی نہ رہ جائے گی، ان کے تمام فلسفے اور سیاسی و معاشی نظریے آپ کی سچائی اور راست روی کے مقابلہ میں جھوٹے ملمع ثابت ہوں گے، اور وہ طاقتیں جو آج ان کے کیمپ میں نظر آ رہی ہیں ٹوٹ ٹوٹ کر اسلام کے کیمپ میں آتی چلی جائیں گی حتیٰ کہ ایک وقت وہ آئے گا جب کمیونزم خود ماسکو میں اپنے بچاؤ کے لیے پریشان ہوگا، سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی خود واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے تحفظ کے لیے لرزہ براندام ہوگی، مادہ پرستانہ الحاد خود لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں جگہ پانے سے عاجز ہوگا، نسل پرستی اور قوم پرستی خود برہمنوں اور جرمنوں میں اپنے معتقد نہ پا سکے گی، اور یہ دور صرف تاریخ میں ایک داستان عبرت کی حیثیت سے باقی رہ جائے گا کہ اسلام جیسی عالمگیر و جہانکشا طاقت کے نام لیوا کبھی اتنے بے وقوف ہو گئے تھے کہ عصائے موسیٰ بغل میں تھا اور لاٹھیوں اور رسیوں کو دیکھ دیکھ کر کانپ رہے تھے —— یہ مستقبل تو آپ کا اس صورت میں ہے جبکہ آپ اسلام کے مخلص پیرو اور سچے گواہ ہوں۔ لیکن اگر اس کے برعکس آپ کا رویہ یہ رہا کہ خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت پر مار زر بنے بیٹھے ہیں۔ نہ خود اس سے مستفید ہوتے ہیں نہ دوسروں کو اس کا فائدہ پہنچنے دیتے ہیں اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر نمائندے اسلام کے بنے ہوئے ہیں مگر اپنے مجموعی قول و عمل سے شہادت زیادہ تر جاہلیت، شرک، دنیا پرستی اور اخلاقی بے قیدی کی دے رہے ہیں، خدا کی کتاب طاق پر رکھی ہے اور رہنمائی کے لیے ہر امام کفر اور ہر منبع ضلالت کی طرف رجوع کیا جا رہا ہے، دعویٰ خدا کی بندگی کا ہے اور بندگی ہر شیطان اور ہر طاغوت کی کی جا رہی ہے، دوستی اور دشمنی نفس کے لیے ہے اور فریق دونوں صورتوں میں اسلام کو بنایا جا رہا ہے اور اس طرح اپنی زندگی کو بھی اسلام کی برکتوں سے محروم کر رکھا ہے اور دوسروں کو بھی اسکی طرف راغب کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر رہے ہیں تو اس صورت میں نہ آپ کی دنیا ہی درست ہو سکتی ہے اور نہ آخرت۔ اس کا انجام تو سنت اللہ کے مطابق وہی کچھ ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں اور بعید نہیں کہ مستقبل اس حال سے بھی بدتر ہو۔ اسلام کا لیبل اتار کر کھلم کھلا کفر اختیار کر لیجیے تو کم از کم آپ کی دنیا تو ویسی بن جائیگی

جیسی امریکہ، روس اور برطانیہ کی بنی ہوئی ہے۔ لیکن مسلمان ہو کر نامسلمان بنے رہنا اور خدا کے دین کی جھوٹی نمائندگی کر کے دنیا کے لیے بھی ہدایت کا دروازہ بند کر دینا وہ جرم ہے جو آپ کو دنیا میں بھی پنپنے نہ دے گا۔ اس جرم کی جو سزا قرآن میں لکھی ہوئی ہے اور جس کا زندہ ثبوت یہودی قوم آپ کے سامنے موجود ہے، اس کو آپ ٹال نہیں سکتے خواہ متحدہ قومیت کے "اہون البلیتین" کو اختیار کریں یا اپنی الگ قومیت منوا کر وہ سب کچھ حاصل کر لیں جو مسلم قوم پرستی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس کے ٹلنے کی صورت صرف یہی ہے کہ اس جرم سے باز آجائیے۔

اب میں مختصراً آپ کو بتاؤں گا کہ ہم کس غرض کے لیے اٹھے ہیں۔ ہم اُن سب لوگوں کو، جو اسلام کو اپنا دین مانتے ہیں، یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس دین کو واقعی اپنا دین بنائیں۔ اس کو انفرادی طور پر اپنی زندگی میں اور اجتماعی طور پر اپنے گھروں میں، اپنے خاندان میں، اپنی سوسائٹی میں، اپنی تعلیم گاہوں میں، اپنے ادب اور صحافت میں، اپنے کاروبار اور معاشی معاملات میں، اپنی انجمنوں اور قومی اداروں میں، اور بحیثیت مجموعی اپنی قومی پالیسی میں عملاً قائم کریں، اور اپنے قول اور عمل سے دنیا کے سامنے اس کی سچی گواہی دیں۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اقامتِ دین اور شہادتِ حق تمہاری زندگی کا اصل مقصد ہے اس لیے تمہاری تمام سعی و عمل کا مرکز یہی ایک چیز کو ہونا چاہیے۔ ہر اُس بات اور کام سے دستکش ہو جاؤ جو اسلام کی ضد ہو اور جس سے اسلام کی غلط نمائندگی ہوتی ہو۔ اسلام کو سامنے رکھ کر اپنے پورے قولی اور عملی رویہ پر نظرِ ثانی کرو، اور اپنی تمام کوششیں اس راہ میں لگا دو کہ دین پورا کا پورا عملاً قائم ہو جائے، اس کی شہادت ٹھیک ٹھیک ادا ہو اور اس کی طرف دنیا کو ایسی دعوت دی جائے جو اتمامِ حجت کے لیے کافی ہو۔

یہ جماعتِ اسلامی کے قیام کی واحد غرض ہے۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے جو طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلاتے ہیں اور انھیں صاف صاف بتاتے ہیں کہ اسلام کیا ہے، اس کے تقاضے کیا ہیں، مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں، اور مسلمان ہونے کے ساتھ کیا ذمہ داریاں آدمی پر عائد ہوتی ہیں۔

اس چیز کو جو لوگ سمجھ لیتے ہیں ان کو پھر ہم یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کے سب تقاضے انفرادی طور پر پورے نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے لیے اجتماعی سعی ضروری ہے۔ دین کا ایک بہت ہی قلیل حصہ انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو تم نے قائم کر بھی لیا تو نہ پورا دین ہی قائم ہوگا اور نہ اس کی شہادت ہی ادا ہو سکے گی، بلکہ جب اجتماعی زندگی پر نظام کفر مسلط ہو تو خود انفرادی زندگی کے بھی بیشتر حصوں میں دین قائم نہ کیا جا سکے گا اور اجتماعی نظام کی گرفت روز بروز اس انفرادی اسلام کی حدود کو گھٹاتی چلی جائے گی۔ ایسے پورے دین کو قائم کرنے اور اس کی صحیح شہادت ادا کرنے کے لیے قطعی ناگزیر ہے کہ تمام ایسے لوگ جو مسلمان ہونے کی ذمہ داریوں کا شعور اور انھیں ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، متحد ہو جائیں اور منظم طریقے سے دین کو عملاً قائم کرنے اور دنیا کو اس کی طرف دعوت دینے کی کوشش کریں اور ان مزاحمتوں کو راستے سے ہٹائیں جو اقامتِ دین و دعوتِ دین کی راہ میں حائل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دین میں جماعت کو لازم قرار دیا گیا ہے اور اقامتِ دین اور دعوتِ دین کی جدوجہد کے لیے ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک منظم جماعت ہو پھر خدا کی راہ میں سعی و جہد کی جائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جماعت کے بغیر زندگی کو جاہلیت کی زندگی، اور جماعت سے علیحدہ ہو کر رہنے کو اسلام سے علیحدگی کا ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔[1]

---

[1] اشارہ ہے اس حدیث کی طرف جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

انا امرکم بخمس اللہ امرنی بھن، الجماعۃ والسمع، والطاعۃ، والھجرۃ، والجہاد فی سبیل اللہ، فانہ من خرج من الجماعۃ قید شبرٍ فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع، ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھو من جثی جھنم۔ قالوا یارسول اللہ وان صام وصلی؟ قال وان صلی وصام وزعم انہ مسلم۔ (احمد و حاکم)

میں تم کو پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے: جماعت، سمع، طاعت، ہجرت، اور خدا کی راہ میں جہاد۔ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اتار پھینکا الا یہ کہ وہ پھر جماعت کی طرف پلٹ آئے، اور جس نے جاہلیت (یعنی افتراق، انتشار) کی دعوت دی وہ جہنمی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے؟ فرمایا ہاں اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۹ پر)

جو لوگ اس بات کو بھی سمجھ لیتے ہیں اور اس فہم سے ان کے اندر مسلمان ہونے کی ذمہ داری کا احساس اتنی حد تک قوی ہو جاتا ہے کہ اپنے دین کی خاطر اپنی انفرادیت اور خود پرستی کو قربان کر کے جماعتی نظم کی پابندی قبول کر لیں، ان سے ہم کہتے ہیں کہ اب تمہارے سامنے تین راستے ہیں اور تمہیں پوری آزادی ہے کہ ان میں سے جس کو چاہو اختیار کرو۔ اگر تمہارا دل گواہی دے کہ ہماری دعوت، عقیدہ، نصب العین، نظام جماعت اور طریق کار سب کچھ خالص اسلامی ہے اور ہم وہی کام کرنے اٹھے ہیں جو قرآن و حدیث و سے امت مسلمہ کا اصل کام ہے تو ہمارے ساتھ آجاؤ۔ اگر کسی وجہ سے تمہیں ہم پر اطمینان نہ ہو اور دوسری جماعت تم کو ایسی نظر آتی ہو جو خالص اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریق پر کام ہو تو اس میں شامل ہو جاؤ —— ہم خود بھی ایسی جماعت پاتے تو اسی میں شامل ہو جاتے ہیں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چننے کا شوق نہیں ہے —— اور اگر تم کو نہ ہم پر اطمینان ہے نہ کسی دوسری جماعت پر تو پھر تمہیں اپنے فرض اسلامی کو ادا کرنے کے لیے خود اٹھنا چاہیے اور اسلامی طریق پر ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جس کا مقصد پورے دین کو قائم کرنا اور قول و عمل سے اس کی شہادت دینا ہو۔ ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی تم اختیار کرو گے ان شاء اللہ حق پر ہو گے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸) اس حدیث سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) کار دین کی صحیح ترتیب یہ ہے کہ پہلے جماعت ہو، اور اس کے اندر ایسی تنظیم ہو کہ سب لوگ کسی ایک کی بات سنیں اور اس کی اطاعت کریں، پھر جیسا بھی موقع ہو اس کے لحاظ سے ہجرت اور جہاد کیا جائے۔

(۲) جماعت سے علیحدہ ہو کر رہنا گویا اسلام سے علیحدہ ہونا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس زندگی کی طرف واپس جا رہا ہے جو اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں عربوں کی تھی کہ ان میں کوئی کسی کی سننے والا نہ تھا۔

(۳) اسلام کے بیشتر تقاضے اور اس کے اصل مقاصد جماعت اور اجتماعی سعی ہی سے پورے ہو سکتے ہیں، اسی لیے حضور نے جماعت سے الگ ہونے والے کو اس کی نماز و روزے اور مسلمانی کے دعوے کے باوجود اسلام سے نکلنے والا قرار دیا۔ اسی مضمون کی شرح ہے جو حضرت عمرؓ نے اپنے اس ارشاد میں فرمائی ہے کہ لا اسلام الا بجماعۃ (جامع بیان العلم لابن عبد البر)۔

ہم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا اور نہ بسلامتی ہوش و حواس ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ صرف ہماری ہی جماعت حق پر ہے اور جو ہماری جماعت میں نہیں ہے وہ باطل پر ہے۔ ہم نے کبھی لوگوں کو اپنی جماعت کی طرف دعوت نہیں دی ہے۔ ہماری دعوت تو صرف اس فرض کی طرف ہے جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم پر اور آپ پر یکساں عائد ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کو ادا کر رہے ہیں تو برحق ہیں خواہ ہمارے ساتھ مل کر کام کریں یا نہ کریں۔ البتہ یہ بات کسی طرح درست نہیں ہے کہ آپ نہ خود اٹھیں، نہ کسی اٹھنے والے کا ساتھ دیں، اور طرح طرح کے حیلے اور بہانے کر کے اقامت دین اور شہادت علی الناس کے فریضہ سے جی چرائیں یا ان کاموں میں اپنی قوتیں خرچ کریں جن سے دین کے بجائے کوئی دوسرا نظام قائم ہو اور اسلام کے بجائے کسی اور چیز کی گواہی آپ کے قول و عمل سے ملے۔ معاملہ دنیا اور اس کے لوگوں سے ہوتا تو حیلوں اور بہانوں سے کام چل سکتا تھا۔ مگر یہاں تو معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جو علیم بذات الصدور ہے۔ اسے کسی چال بازی سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ہی مقصد اور ایک ہی کام کے لیے مختلف جماعتیں بننا بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں انتشار کا بھی اندیشہ ہے۔ مگر جب نظام اسلامی درہم برہم ہو چکا ہو اور سوال صرف اس نظام کے چلانے کا نہیں بلکہ اس کے از سر نو قائم کرنے کا ہو، تو ممکن نہیں ہے کہ ابتدا ہی میں وہ الجماعت وجود میں آجائے جو تمام امت کو شامل ہو، جس کا التزام ہر مسلمان پر واجب ہو، اور جس سے علیحدہ رہنا جاہلیت اور علیحدہ ہونا ارتداد کا ہم معنی ہو۔ آغاز کار میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ جگہ جگہ مختلف جماعتیں اس مقصد کے لیے بنیں اور اپنے اپنے طور پر کام کریں۔ یہ سب جماعتیں بالآخر ایک ہو جائیں گی اگر نفسانیت اور افراط و تفریط سے پاک ہوں اور خلوص کے ساتھ اصل اسلامی مقصد کے لیے اسلامی طریق پر کام کریں۔ حق کی راہ میں چلنے والے زیادہ دیر تک الگ نہیں رہ سکتے۔ حق ان کو جمع کر کے ہی رہتا ہے، کیونکہ حق کی فطرت ہی جمع و تالیف اور وحدت و یگانگت کی متقاضی ہے۔ تفرقہ صرف اس صورت میں رونما ہوتا ہے جب حق کے ساتھ کچھ نہ کچھ باطل کی آمیزش ہو یا اوپر حق کی نمائش ہو اور اندر باطل کام کر رہا ہو۔

اب میں اختصار کے ساتھ یہ بھی عرض کر دوں کہ جو لوگ ہماری جماعت کو پسند کر کے اس میں داخل

ہوتے ہیں ان سے ہمارا مطالبہ کیا ہوتا ہے اور ان کے لیے ہمارے پاس کام کیا ہے۔ اپنے ارکان سے ہمارا کوئی مطالبہ اس مطالبہ کے سوا نہیں ہے جو اسلام نے ہر مسلمان سے کیا ہے۔ ہم نہ تو اسلام کے اصل مطالبے پر ذرہ برابر کسی چیز کا اضافہ کرتے ہیں اور نہ اس میں سے کوئی چیز گھٹاتے ہیں۔ ہم ہر شخص کے سامنے پورے اسلام کو بے کم و کاست پیش کر دیتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ اس دین کو جان بوجھ کر شعور کے ساتھ قبول کرو، اس کے تقاضوں کو سمجھ کر ٹھیک ادا کرو، اپنے خیالات اور اقوال و اعمال میں سے ہر اس چیز کو خارج کرو جو دین کے احکام اور اس کی روح کے خلاف ہو اور اپنی پوری زندگی سے اسلام کی شہادت دو۔ بس یہی ہمارے ہاں داخلہ کی فیس ہے اور یہی ہمارے قواعد رکنیت ہیں۔ ہمارا دستور، ہمارا نظام جماعت اور وہ چیز جس کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں، سب کے سامنے عیاں ہے۔ اس کا جائزہ لے کر ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ہم نے اصل اسلام میں —— اس اسلام میں جو قرآن اور سنت پر مبنی ہے —— نہ کوئی کمی کی ہے نہ بیشی، اور ہم ہر وقت تیار ہیں کہ ہماری جس چیز کے متعلق بھی کوئی ثابت کر دیگا کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیم پر اضافہ ہے اسے ہم اپنے ہاں سے خارج کر دیں گے اور جس چیز کے متعلق بھی بتادے گا کہ وہ اس تعلیم میں ہے اور ہمارے ہاں نہیں ہے اسے ہم بلا تامل اختیار کرلیں گے کیونکہ ہم تو اٹھے ہی پورے دین کی بے کم و کاست اقامت اور شہادت کے لیے ہیں پھر ہم سے بڑا ظالم اور کون ہوگا اگر ہم اپنے اسی مقصد میں منافق ثابت ہوں۔

اس طرح جو لوگ ہمارے نظام جماعت میں داخل ہوتے ہیں ان کے لیے ہمارے پاس صرف یہ کام ہے کہ وہ اپنے قول اور عمل سے اسلام کی شہادت دیں اور نظام دین کو مکمل طور پر قائم کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کریں تاکہ شہادت علی الناس کا حق پوری طرح ادا ہو سکے۔ جہاں تک قولی شہادت کا تعلق ہے، ہم اپنے ارکان کو ایسی تربیت دے رہے ہیں جس سے وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق زبان اور قلم سے اسلام کی زیادہ سے زیادہ معقول شہادت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ نیز ہم ایسے ادارے بھی قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو منظم طریقہ سے علم و ادب کے ہر شعبہ میں، زندگی کے جملہ مسائل سے متعلق اسلامی تعلیمات کی حقانیت کو دنیا پر واضح کریں اور اس مقصد کے لیے نشر و اشاعت کے

تمام ممکن ذرائع سے کام لیں۔ رہی عملی شہادت تو اس بارے میں ہماری کوشش یہ ہے کہ اول تو ایک ایک شخص اسلام کا زندہ گواہ ہو، پھر ان افراد سے ایک ایسی منظم سوسائٹی نشوونما پائے جس کے اندر اسلام اپنی اصل اسپرٹ میں کام کرتا ہوا دیکھا جا سکتا ہو، اور بالآخر یہ سوسائٹی اپنی جد و جہد سے نظام باطل کے غلبہ کو مٹا کر وہ نظام حق قائم کرے جو دنیا میں اسلام کی مکمل نمائندگی کرنے والا ہو۔

حضرات! بس یہ ہے ہمارا مقصد اور یہ ہے ہمارا پروگرام۔ ہمیں امید نہ تھی کہ یہ چیز بھی ایسی ہو سکتی ہے جس پر کسی مسلمان کو اعتراض ہو۔ مگر جس روز سے ہم نے اس راہ میں قدم رکھا ہے اعتراضات کا ایک نہ رکنے والا سیلاب ہے کہ امڈا چلا آ رہا ہے۔ تمام اعتراضات تو نہ قابل توجہ ہیں اور نہ ایک صحبت میں ان سب سے تعرض ہی کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس موقع پر میں صرف ان چند اعتراضات پر کچھ عرض کروں گا جو آپ کے شہر میں غلط فہمیاں پھیلانے کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ تمہاری یہ جماعت اسلام میں ایک نئے فرقہ کی بنا ڈال رہی ہے ـــ یہ بات جو لوگ کہتے ہیں، انہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ فرقہ بندی کے اصل اسباب کیا ہوتے ہیں۔ دین میں جن باتوں کی وجہ سے تفرقہ برپا ہوتا ہے ان سب کا اگر آپ استقصا کریں گے تو وہ صرف چار عنوانات پر تقسیم ہوں گی۔ ایک یہ کہ اصل دین پر کسی ایسی چیز کا اضافہ کیا جائے جو دین میں نہ ہو اور اسی کو اختلاف کفر و ایمان یا فرقِ ہدایت و ضلالت کی بنیاد بنا ڈالا جائے۔ دوسرے یہ کہ دین کے کسی خاص مسئلے کو لے کر اس کو وہ اہمیت دی جائے جو کتاب و سنت کی رو سے اس کو حاصل نہیں ہے اور اسی کو گروہ بندی کی بنا قرار دے لیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اجتہادی و استنباطی مسائل میں غلو کیا جائے اور ان امور میں اپنے مسلک کے سوا دوسرے مسلک والوں کی تفسیق و تضلیل یا تکفیر کی جائے یا کم از کم ان سے امتیازی معاملہ کیا جائے۔ چوتھے یہ کہ نبی کے بعد کسی خاص شخصیت کے معاملہ میں غلو کیا جائے اور اس کے لیے کسی ایسے منصب کا دعویٰ کیا جائے جسے تسلیم کرنے یا نہ کرنے پر آدمی کے مومن یا کافر ہونے کا مدار ہو، یا کوئی جماعت یہ دعویٰ کرے کہ جو اس میں داخل ہے صرف وہی حق پر ہے، باقی سب مسلمان باطل پر ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ ہم نے ان چار ذیل عنوانات میں سے کس عنوان کی غلطی

کی ہے؟ اگر کوئی صاحب دلیل و ثبوت کے ساتھ ہمیں صاف صاف بتا دیں کہ ہم نے واقعی فلاں عنوان کی غلطی کی ہے تو ہم فی الفور توبہ کریں گے اور ہمیں اپنی اصلاح کرنے میں ہرگز تامل نہ ہوگا۔ کیونکہ ہم خدا کے دین کو قائم کرنے کے لیے اٹھے ہیں، تفرقہ برپا کرنے نہیں اٹھے ہیں۔ لیکن اگر ایسی کوئی غلطی ہم نے نہیں کی ہے تو پھر ہمارے کام سے کسی فرقے کی پیدائش کا اندیشہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔

ہم صرف اصل اسلام اور بے کم و کاست پورے اسلام کو لے کر اٹھے ہیں اور مسلمانوں کو ہماری دعوت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آؤ ہم سب مل کر اس کو عملاً قائم کریں اور دنیا کے سامنے اس کی شہادت دیں۔

اجتماع کی بنیاد ہم نے پورے دین کو قرار دیا ہے، نہ کہ اس کے کسی ایک مسئلے یا چند مسائل کو۔

اجتہادی مسائل میں ہم تمام ان مذاہب و مسالک کو برحق تسلیم کرتے ہیں جن کے لیے قواعد شریعت میں گنجائش ہے۔ ہر ایک کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ ان مذاہب و مسالک میں سے جس کا جس پر اطمینان ہو وہ اپنی حد تک اس پر عمل کرے۔ اور کسی خاص اجتہادی مسلک کی بنیاد پر گروہ بندی کو ہم جائز نہیں رکھتے۔

اپنی جماعت کے بارے میں بھی ہم نے کوئی غلو نہیں کیا ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ حق صرف ہماری جماعت میں دائر و منحصر ہے۔ ہم کو اپنے فرض کا احساس ہوا اور ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ کو آپ کا فرض یاد دلا رہے ہیں۔ اب یہ آپ کی خوشی ہے کہ آپ ہمارے ساتھ کھڑے ہوں، یا خود اٹھیں اور اپنا فرض ادا کریں، یا جو بھی آپ کو یہ فرض ادا کرتا نظر آئے اس کے ساتھ مل جائیں۔

امارت کے باب میں بھی ہم کسی غلو کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔ ہماری یہ تحریک کسی شخصیت کے بل پر نہیں اٹھی ہے جس کے لیے کسی خاص منصب کا دعویٰ کیا گیا ہو، جس کی کرامتوں اور الہامات اور تقدس کی داستانوں کا اشتہار دیا جاتا ہو، جس کی ذاتی عقیدت پر جماعت کی بنیاد رکھی گئی ہو، اور جس کی طرف لوگوں کو دعوت دی جاتی ہو۔ دعووں اور خوابوں اور کشوف و کرامات اور شخصی تقدس کے تذکروں سے ہماری تحریک بالکل پاک ہے۔ یہاں دعوت کسی شخص کی طرف نہیں ہے بلکہ اُس

مقصد کی طرف ہے جو قرآن کی رو سے ہر مسلمان کا مقصدِ زندگی ہے اور ان اصولوں کی طرف ہے جن کے مجموعے کا نام اسلام ہے۔ جو لوگ بھی اس مقصد کے لیے اُن اصولوں پر ہمارے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیں وہ مساوی حیثیت سے ہماری جماعت کے رکن بنتے ہیں۔ یہ ارکان ایک شخص کو اپنا امیر منتخب کرتے ہیں۔ نہ اس بنا پر کہ امارت اس کا کوئی ذاتی حق ہے بلکہ اس بنا پر کہ بہرحال منظم طریقہ پر کام کرنے کے لیے ایک سربراہ کار ہونا ہی چاہیے۔ یہ منتخب کردہ امیر معزول کیا جا سکتا ہے اور جماعت میں سے کوئی دوسرا شخص اس کی جگہ امارت کے لیے چنا جا سکتا ہے۔ یہ امیر صرف اسی جماعت کا امیر ہے نہ کہ تمام امت کا۔ اس کی اطاعت صرف انہی لوگوں پر لازم ہے جو اس جماعت میں شامل ہوں۔ اور ہمارے ذہنوں میں ایسا کوئی تصور تک نہیں ہے کہ "جس کی گردن میں اس کی بیعت کا قلادہ نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرے گا"۔

اب خدا را مجھے بتائیے کہ جب ہم اس طریقہ پر کام کر رہے ہیں تو آخر ہماری اس تحریک سے امت میں ایک نیا فرقہ کیسے بن جائے گا؟ عجیب تر بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے دامن خود اُن غلطیوں سے آلودہ ہیں جن کی وجہ سے فرقہ بندی کا فتنہ رونما ہوتا ہے، جن کے ہاں خوابوں اور کشفوں اور کرامتوں کے چرچے ہیں، جن کے ہاں سارا کام کسی "حضرت" کی شخصی عقیدت کے بل پر چل رہا ہے، جن کے ہاں کسی شخصیت کے لیے کسی مخصوص منصب کا دعویٰ کیا جاتا ہے، جن کے ہاں فروعی مسائل پر جھگڑے اور مناظرے ہوتے ہیں اور اجتہادی مسالک پر دھڑے بندیاں کی جاتی ہیں، وہی ہم کو الزام دینے میں پیش پیش ہیں۔ اگر کوئی برا نہ مانے تو میں صاف کہوں کہ ہمارا اصل قصور جس پر یہ حضرات بگڑے ہوئے ہیں وہ نہیں ہے جو یہ زبانوں سے کہتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم نے دین کے اُس اصلی کام کی طرف دعوت دی جو ان کے نفس کو مرغوب نہیں ہے، اور اس کام کے لیے وہ صحیح طریقہ اختیار کیا جس سے ان کے اپنے طریقوں کی غلطیاں بے نقاب ہونے لگیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ اگر تمہیں یہی کام کرنا تھا تو ضرور کرتے مگر تم نے ایک الگ جماعت مستقل نام کے ساتھ کیوں بنائی، اس سے تو امت میں انتشار پیدا ہوتا ہے ــــــ فی الواقع یہ ایک عجیب اعتراض ہے۔ میں حیران ہوں کہ جب لادینی یا خلافِ دین سیاست کے لیے، غیر اسلامی تعلیم کے لیے، مذہبی

دھڑے بندیوں کے لیے، اور خالص دنیوی اغراض کے لیے مغرب کے جمہوری یا فاشستی طریقوں پر مسلمانوں کی انجمنیں اور جماعتیں متفرق ناموں کے ساتھ بنتی ہیں تو انھیں ٹھنڈے دل سے برداشت کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر دین کے اصل کام کے لیے خالص دینی اصولوں پر کوئی جماعت بنتی ہے تو یکایک امت میں انتشار کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور صرف یہی ایک جماعت سازی قابل برداشت نہیں ہوتی۔ اس سے تو شبہ ہوتا ہے کہ معترضین کو اصل میں چڑھ جماعت سازی سے نہیں بلکہ اس بات سے ہے کہ کوئی جماعت دین کے اصل کام کے لیے بنے۔ تاہم میں ان سے عرض کروں گا کہ جماعت سازی کا یہ تصور ہم نے مجبوراً کیا ہے نہ کہ شوقیہ۔ سب کو معلوم ہے کہ اس جماعت کی تشکیل سے پہلے میں برسوں اکیلا پکارتا رہا ہوں کہ مسلمانو! یہ تم کن راہوں میں اپنی قوتیں اور کوششیں صرف کر رہے ہو، تمہارے کرنے کا اصل کام تو یہ ہے، اس پر اپنی تمام مساعی مرکوز کرو۔ یہ دعوت اگر سب مسلمان قبول کر لیتے تو کتنا ہی کیا تھا۔ مسلمانوں میں ایک جماعت بننے کے بجائے مسلمانوں کی ایک جماعت بنتی اور وہ کم از کم ہندوستان کی حد تک وہ "الجماعت" ہوتی جس کی موجودگی میں کوئی دوسری جماعت بنانا شرعاً حرام ہوتا۔ یہ بھی نہیں تو مسلمانوں کی مختلف جماعتوں میں سے کوئی ایک ہی اسے مان لیتی تب بھی ہم راضی تھے، اسی میں بخوشی شامل ہو جاتے۔ مگر جب پکار پکار کر ہم تھک گئے اور کسی نے سن کر نہ دیا تب ہم نے مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ وہ سب لوگ جو اس کام کو حق اور فرض سمجھ چکے ہیں خود ہی مجتمع ہوں اور اس کے لیے اجتماعی سعی کریں۔ سوال یہ ہے اگر یہ نہیں تو ہمیں اور کیا کرنا چاہیے تھا؟ تم کو اگر اس کام کے فرض ہونے سے انکار ہے تو دلیلِ انکار ارشاد ہو۔ اگر انکار نہیں تو بتاؤ کیا واقعی تمہاری یہ مختلف انجمنیں اور جماعتیں یہی فرض انجام دے رہی ہیں؟ اگر یہ بھی نہیں تو کیا اب تمہارے ہاں نوبت یہ آگئی ہے کہ جو فرض کو پہچانے اور اسے ادا کرنے کے لیے اٹھے وہی الٹا قصور وار قرار دیا جائے؟

ہم سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تم نے اپنی جماعت کے لیڈر کے لیے "امیر" کا لفظ کیوں اختیار کیا؟ امیر یا امام تو صرف با اختیار اور صاحب سلطنت ہی ہو سکتا ہے۔ اس کی تائید میں کچھ حدیثیں بھی پیش کی جاتی ہیں جن سے استدلال کیا جاتا ہے کہ امامت یا تو امامت علم ہے، یا امامت نماز، یا امامت قتال و

جہاد۔ اس کے سوا کوئی تیسری قسم امامت کی نہیں ہے ـــــ یہ اعتراض جو حضرات کرتے ہیں وہ صرف اُس وقت کی فقہ اور اسی وقت کی احادیث سے واقف ہیں جب اسلامی نظام سیاسی اقتدار کی منزل پر پہنچ چکا تھا اور صاحب سیف امامت قائم ہو گئی تھی، مگر ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جب سیف چھن جائے، مسلمانوں کی جماعت اختیار و اقتدار سے محروم ہو جائے اور اسلامی نظام جماعت بھی درہم برہم ہو جائے تو اس وقت کے لیے کیا احکام ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ ایسی حالت میں کیا مسلمانوں کو یہی کرنا چاہیے کہ فرد فرد الگ ہو جائے اور بیٹھ کر بس دعا کرتا رہے کہ خدایا کوئی صاحبِ سیف امام بھیج دے؟ یا ایسی امامت قائم کرنے کے لیے کوئی اجتماعی سعی بھی ہونی چاہیے؟ اگر وہ کہتے ہیں کہ اجتماعی سعی ہونی چاہیے تو براہ کرم وہ ہمیں بتائیں کہ جماعت بنائے بغیر بھی کوئی اجتماعی سعی کی جا سکتی ہے؟ اگر وہ مانتے ہیں کہ جماعت بنائے بغیر چارہ نہیں ہے تو کیا کوئی جماعت کسی رہنما، کسی سربراہ کار، کسی صاحب امر کے بغیر بھی چل سکتی ہے؟ اگر وہ اس کی ضرورت بھی تسلیم کرتے ہیں تو وہ خود ہی ہم کو بتائیں کہ اس اسلامی مقصد کے لیے جو اسلامی جماعت بنائی جائے، اس کے سربراہ کار کے لیے اسلام میں کیا اصطلاح مقرر ہے؟ جو اصطلاح بھی وہ ارشاد فرمائیں گے۔ ہم اسی کو قبول کریں گے، بشرطیکہ وہ ہو اسلامی اصطلاح! یا پھر وہ صاف صاف یہی بتا دیں کہ اسلام میں سیف حاصل ہونے کے بعد کے لیے تو ہدایات موجود ہیں، لیکن "بے سیفی" کی حالت میں سیف کس طرح حاصل کی جائے، اس باب میں اس نے کوئی ہدایت نہیں دی ہے، اور یہ کام جس کو کرنا ہو اسے غیر اسلامی طریقوں پر غیر اسلامی اصطلاحوں سے کرنا چاہیے۔ اگر ان حضرات کا یہ منشا نہیں ہے تو ہمارے لیے یہ معما ناقابل حل ہے کہ صدر، لیڈر، اور قائد وغیرہ اصطلاحیں استعمال کی جائیں تو وہ سب انھیں گوارا ہیں، مگر امیر کی اسلامی اصطلاح سنتے ہی یہ کیوں چراغ پا ہو جاتے ہیں۔

عام طور پر لوگوں کو اس مسئلہ کے سمجھنے میں جو دقت پیش آتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم نے جہاں جہاں امیر یا امام کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی اس وقت اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی، اور جس زمانہ میں اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی تھی اس وقت حضورؐ خود نبی کی حیثیت سے اقامت دین کی

جدوجہد کی قیادت فرما رہے تھے، اس لیے امارت یا امامت کی اصطلاحیں استعمال کرنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ لیکن اسلام کے پورے نظام پر نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دین مسلمانوں کے ہر اجتماعی کام میں نظم چاہتا ہے اور اس نظم کی صحیح صورت یہ تجویز کرتا ہے کہ کام جماعت بن کر کیا جائے، جماعت میں سمع وطاعت ہو اور ایک شخص اس کا امیر ہو۔ نماز پڑھی جائے تو جماعت کے ساتھ پڑھی جائے اور ایک اس کا امام ہونا چاہیے، حج کیا جائے تو منظم طریق پر کیا جائے اور ایک اس کا امیر حج ہونا چاہیے حتیٰ کہ تین آدمی اگر سفر کو نکلیں تب بھی ان کو منظم طریقے سے سفر کرنا چاہیے اور اپنے ایک ساتھی کو امیر بنا لینا چاہیے۔ اذا خرج ثلاثۃ فی سفر فلیؤمروا علیھم احدھم[1] (ابوداؤد) اسلامی شریعت کی یہی وہ روح ہے جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ جماعت کے بغیر اسلام نہیں اور امارت کے بغیر جماعت نہیں اور اطاعت کے بغیر امارت نہیں۔[2] پس ہمارا استنباط یہ ہے کہ اقامت دین اور شہادت علی الناس کی سعی کے لیے جو جماعت بنائی جائے اس کے سربراہ کار کے لیے امیر یا امام کے لفظ کا استعمال بالکل صحیح ہے، مگر چونکہ لفظ امام کے ساتھ بعض خاص معانی لگ گئے ہیں اس لیے ہم نے فتنے سے بچنے کی خاطر اس لفظ کو چھوڑ کر امیر کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ایک نرالا اعتراض یہاں یہ بھی سننے میں آیا کہ جو شخص اس طرح جماعت کا سربراہ کار بنایا جائے اس کو زکوٰۃ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیونکہ زکوٰۃ صرف اسلامی حکومت کا امیر ہی وصول کر سکتا ہے ـــــ غالباً ان معترضین کو تحصیل زکوٰۃ کے معاملہ میں ہمارا طریقہ معلوم نہیں ہے۔ ہم نے

---

[1] بلکہ مسند احمد میں جو روایت حضرت عبداللہ ابن عمر سے نقل کی گئی ہے اس میں تو یہ الفاظ ہیں کہ لا یحل لثلاثۃ یکونوا بفلاۃ من الارض الا امروا علیھم احدھم۔ (حلال نہیں ہے یہ بات کہ تین آدمی کسی جنگل میں ہوں اور وہ اپنے اوپر اپنے میں سے ایک کو امیر نہ بنا لیں)۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف سفر ہی میں نہیں، بلکہ ہر حالت میں مسلمانوں کو منظم زندگی بسر کرنی چاہیے اور ان کا کوئی اجتماعی کام بھی جماعت اور امارت کے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔

[2] لا اسلام الا بجماعۃ ولا جماعۃ الا بامارۃ ولا امارۃ الا بطاعۃ۔

(جامع بیان العلم لابن عبدالبر)

عام مسلمانوں سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ ہمارے بیت المال میں داخل کریں اور نہ ہم نے کبھی یہ کہا ہے کہ جو مسلمان زکوٰۃ ہمارے حوالہ نہ کرے گا اس کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ ہم صرف اپنی جماعت کے ارکان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی زکوٰۃ جماعت کے بیت المال میں داخل کیا کریں، اور اس سے ہمارا بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو شریعت کے منشا کے مطابق اجتماعی طور پر زکوٰۃ جمع اور صرف کرنے کی عادت ہو۔ براہ کرم کوئی ہمیں بتائے کہ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو اس میں کیا شرعی قباحت ہے اور یہ کس حکم شرعی کے خلاف ہے؟ اگر ہمیں لوگوں سے یہ کہنے کا حق ہے کہ نماز گھروں میں الگ الگ نہ پڑھو بلکہ جماعت کے ساتھ پڑھو تو آخر یہ کہنے کا حق کیوں نہیں ہے کہ زکوٰۃ انفرادی طور پر ادا کرنے کے بجائے اجتماعی طور پر ادا کرو؟ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اگر چندہ لیا جائے تو جائز، داخلے کی فیس اور رکنیت کی فیس لگائی جائے تو درست، مگر خدا اور رسول کے عائد کیے ہوئے فرض کو ادا کرنے کی دعوت دی جائے تو ناجائز!

اس سے بھی زیادہ ایک نرالا اعتراض یہ سننے میں آیا کہ "تم نے بیت المال کیوں بنایا؟" ــــ اس قسم کے اعتراضات سن کر معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو شاید اسلام کی اصطلاحات ہی سے کچھ بغض ہو گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر جماعت اور ہر انجمن اپنا ایک خزانہ ضرور رکھتی ہے تاکہ اجتماعی کاموں میں مال صرف کر سکے۔ ہماری جماعت کا بھی ایک خزانہ ہے اور اس کو ہم بیت المال کہتے ہیں، کیونکہ یہی اسلامی اصطلاح ہے۔ اگر ہم اس کا نام خزانہ رکھتے تو ان کو کوئی اعتراض نہ تھا اگر اس کو ہم Treasury کہتے تب بھی یہ خوش ہوتے۔ مگر جب ہم نے اس کے لیے ایک اسلامی اصطلاح استعمال کی تو اس کو یہ برداشت نہ کر سکے۔

ان اعتراضات میں سے اکثر اتنے مہمل ہیں کہ میں ان کا ذکر کر کے اور ان کا جواب دے کر حاضرین کا وقت ضائع کرنا کبھی پسند نہ کرتا، مگر میں نے یہ چند چیزیں نمونے کے طور پر صرف اس لیے پیش کی ہیں کہ جو لوگ نہ خود اپنا فرض ادا کرنا چاہتے ہیں، نہ کسی دوسرے کو ادا کرنے دینا چاہتے ہیں وہ کس قسم کے حیلے بہانے اور اعتراضات و شبہات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں۔

کس طرح خدا کے راستے سے خود رکتے ہیں اور دوسروں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارا طریقہ جھگڑے اور مناظرے کرنے کا نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ہماری بات کو سیدھی طرح سمجھنا چاہے تو ہم ہر وقت اس کو سمجھانے کے لیے حاضر ہیں، اور اگر کوئی ہماری غلطی ہم کو معقول طریقے سے سمجھانا چاہے تو ہم سمجھنے کے لیے بھی تیار ہیں، لیکن اگر کسی کے پیش نظر محض الجھنا اور الجھانا ہی ہو تو اس سے ہم کوئی تعرض کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس کو اختیار ہے کہ جب تک چاہے اپنا یہ شغل جاری رکھے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

زکوٰۃ

(معاشیاتی نقطۂ نظر سے)

(۳)

از جناب نعیم صدیقی

زکوٰۃ کنوز | زکوٰۃ کنوز کا حکم جس آیت سے اخذ ہوتا ہے، وہ ہے:۔ "اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَهَا........ الخ" اور اس آیت کی شرح اس تفسیری روایت سے ہوتی ہے جس میں اس آیت کے نزول پر صحابہ کرام کی تشویش کے جواب میں نبی صلعم نے واضح فرمایا ہے کہ آیت کی وعید اس "کنز" سے تعلق رکھتی ہے جس سے اللہ کا حق یعنی زکوٰۃ ادا نہ ہو۔

کنز کے نصاب میں جو احکام نبوی وارد ہیں ان سے معانی اخذ کرنے میں اختلافات پائے جاتے ہیں، لیکن ان اختلافات میں سے جوہر لیا جائے تو

چاندی کا نصاب	=	۵۲ تولہ بوزن رائج
سونے کا نصاب	=	۷ ½ " " "

قرار پاتا ہے۔

اب اس میں قدر واجب وہی ۱/۴۰ یا ۲ ½ ٪ کی شرح سے ہے۔

اس کے بعد ایک اہم سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر وہ نقدی جو سکوں کی شکل میں ہو، کیا اسے بھی زکوٰۃ کا مصدر و ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ذرا سے تامل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ "نقدی" فی الاصل تو سونا چاندی کا نام ہے اور سکے کو درحقیقت حکومت اصل نقدی کا قائم مقام ٹھیراتی ہے اور وہی قوت خرید (Purchasing Value) جو چاندی سونے میں قدیم زمانے

میں چلی آتی ہے، قانوناً سکوں میں منتقل کردیتی ہے۔ اس وجہ سے سکہ درحقیقت چاندی یا سونے ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے فقہاء نے سکوں کو (چاہے وہ کسی دھات کے ہوں) کنوز کے اندر شمار کیا ہے اور عملاً یہی تصور رائج ہے ــــ بجز ان لوگوں کے جو "زر" کی ماہیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس تصور سے اختلاف رکھتے ہیں۔ درحقیقت "زر" چاہے سونے چاندی کے دھات سے وجود پاتے، چاہے چمڑے اور کاغذ کے ٹکڑوں[1] سے، اس کا کسی کے پاس ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کے پاس اس قوت خرید (Purchosing Power) کا سونا چاندی ہے جو قوت خرید کسی "زر مصنوعی" کے لیے قرار دی گئی ہے۔ سکہ حقیقت میں اس امر کی سند ہے کہ ہر شخص اس کی مالیت کے سونے چاندی کا مالک ہے اور جو کچھ اسے سونے چاندی کے بدلے میں ملنا چاہیے وہی کچھ یہ مارکیٹ میں اس سکے کے بدلے میں ہر وقت لے سکتا ہے۔

چونکہ ہندوستان میں معیار "زر مسکوک" چاندی مقرر ہے، اس وجہ سے یہاں سکے کی مالیت (Purchosing Velue) چاندی سے مطابقت دی جاتی رہی ہے، نیز ایک دوسرے نقطۂ نظر سے کہ چاندی اور سونے کے نصابوں میں سے جو صورت زکوٰۃ کے وجوب کو پہلے لازم کرتی ہو، اسے اختیار کرنا چاہیے (یہ بھی فقہا کی استخراجی رائے ہے)، یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سکوں کی مالیت کو چاندی ہی کے مقابل میں رکھ کر دیکھا جائے اور انھیں چاندی کا قائم مقام قرار دیا جائے۔ تیسرے یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ نبی صلعم نے چاندی کو ایک حد تک زکوٰۃ کے مسائل میں معیاری اور بنیادی اہمیت دی ہے اور سونے کو ثانوی، چنانچہ بعض فقہا نے اصل نصاب چاندی کا نصاب ہی قرار دیا ہے اور سونے کے نصاب کو اس سے مطابقت دیتے رہنے کا مسئلہ پیدا کیا ہے۔ اس مسئلہ سے چاہے ہم متفق نہ ہوں،

[1] "زر" کی ماہیت نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض علما جو "سکے" پر زکوٰۃ کا وجوب مانتے بھی ہیں، نوٹ کے معاملہ میں وجوب زکوٰۃ کے خلاف ہیں۔ حالانکہ جس طرح سکہ عملاً بالکل سونے چاندی کا قائم مقام ہے، اسی طرح نوٹ سکے کا قائم مقام ہے۔ نوٹ کی حقیقت کو ایک دوسری طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ دراصل ایک قرض یا امانت دی ہوئی رقم کی ایسی قطعی رسید ہے کہ اس کو ہر وقت cash کرایا جاسکتا ہے اور بالکل سکے کی سی قوت خرید رکھتی ہے۔

مگر چاندی کی "بنیادی" اہمیت بہرحال قابلِ تسلیم ہے۔

اب یہ طے ہو جانا چاہیے کہ سکوں کی کونسی مقدار بحالت موجودہ ۵۲ تولہ چاندی کی قائم مقام ہے ۲۴ فروری ۱۹۴۲ء کو بمبئی کی مارکیٹ میں چاندی کا نرخ ۱۵۳ روپے ۱۲ آنے فی سو تولہ تھا۔ اس حساب سے ۵۲ تولہ چاندی کی قائم مقامی ۷۹ روپے ۹ آنے ۱۳/۲۵ ۱۱ پائی کے سکے کرتے ہیں۔ سہولت کے لیے ہم اس مقدار کو پورے ½۷۹ روپے قرار دے لیں تو کوئی بڑا حرج واقع نہیں ہوگا۔

اس کے بعد ایک اور اہم امر یہ قابل غور ہے چاندی اور سکوں کا نصاب اور سونے کا نصاب کیا الگ الگ ملحوظ رکھا جائے یا مجموعاً دیکھ لیا جائے کہ چاندی یا سونے کے دونوں نصابوں میں سے کوئی مکمل ہوتا ہے یا نہیں، اور پھر جو زکوٰۃ کی زیادہ مقدار واجب کرنے والا نصاب ہو اسے اختیار کر لیا جائے یہ ایک بڑا اہم اختلافی مسئلہ ہے اور ایک گروہ نصابوں کو جمع کرنے کا مخالف ہے اور دوسرا اس کا حامی ہے۔ ہم فقہی نقطۂ نظر سے ان پر کوئی تنقیدی بحث کیے بغیر یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ نصابوں کو جمع کرنے کا اصول اختیار کریں، کیونکہ ہمیں جو حساب مرتب کرنا ہے اس میں تو یہی صورت سہولت پیدا کرتی ہے۔ ایک موٹا حساب اس سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ ½۷۹ روپے کی مالیت کے سکے اور چاندی اور سونا بحیثیت مجموعی جس شخص کے پاس سال بھر جمع رہیں اس پر ½۲ ٪ زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

ہندوستان کی زکوٰۃ کنوز کا اندازہ | ہندوستان کی بینک کے کنوز حسب ذیل صورتوں میں پائے جاتے ہیں:۔

۱۔ زیورات۔ ۲۔ نقد بدست۔ ۳۔ (ا) بنکوں میں رکھوائی ہوئی امانتیں۔ (ب) بیمہ کمپنیوں میں جمع کرائی ہوئی بچتیں۔ (ج) حکومت کو جاری کیے ہوئے قرض۔ (د) بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کے حصص کی داخل کردہ قیمت۔

حقیقت میں ہندوستانی بینک کی زیادہ تر بچتیں تیسری صورت میں پائی جاتی ہیں، اور یہی صورت لمبے اور پیچیدہ حساب کی متقاضی ہے۔ سو اس پر بحث کو موخر کر کے پہلے ہم زیورات اور

"نقد بدست" (Cash in hand) کی صورتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ یہ پہلو ایسا ہے جس کے بارے میں اعداد و شمار کی زبانیں بالکل گُنگ ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ممکن ہے کہ طائر قیاس پرواز کرے اور اس کا ایک طائرانہ جائزہ لے لے۔

ہندوستانی پبلک کی مالی حیثیت کے مختلف پہلو بیان کرتے ہوئے ہم نے لباس کے معاملہ میں جس طبقاتی تقسیم کا تذکرہ کیا ہے، اس میں بتایا تھا کہ ۱۰ فی ہزار آبادی کا لباس خاصہ اچھا ہے[1] پھر ۱۰ فی ہزار کا نسبتاً بہتر ہے،[2] پھر ۱۰ فی ہزار کا بمشکل کافی۔ اس کے بعد بقیہ تعداد ضرورت سے بہت ہی کم لباس رکھتی ہے۔ ان معلومات کی روشنی میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ لباس "اظہارِ نعمت" کا ایک مسلمہ ذریعہ ہے، اور آدمی کی مالی حالت اس سے ایک حد تک واضح ہوا کرتی ہے۔ پس اس نقطۂ نظر سے آخری ۱۰ فی ہزار طبقہ کو فقرا میں رکھ کر پہلے اور دوسرے طبقہ کو جس کا مجموعی تناسب ۲۰ فی ہزار بنتا ہے، ہمیں اغنیاء میں لینا ہے، اور اس کے متعلق یہ "حسن ظن" قائم کرنا ہے کہ اس کے پاس کچھ زیور اور کچھ نقدی بہرحال سال بھر رہتی ہے۔

اس ۲۰ فی ہزار آبادی میں سے احتیاطاً مزید ۵ فی ہزار کو مستثنیٰ کر دیا جائے کہ اس کے اندوختے بھی قدرِ نصاب سے کم ہوں گے۔ لیکن بقیہ ۱۵ فی ہزار کے متعلق ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ان میں خانگی اندوختوں کے لحاظ سے حسبِ ذیل طبقات پائے جاتے ہیں:۔

(۱) اس ۱۵ فی ہزار آبادی کا ۵۰ فی ہزار = ۷۲½ روپے تا ۲۰۰ روپے فی کس۔

(۲) " " " ۳۰ فی ہزار = ۲۰۰ " تا ۵۰۰ " "

[1] یہ ان لوگوں کا طبقہ ہے جو لباس اپنی حیثیت سے کم کا پہنتے ہیں، مگر زیورات اور اندوختہ کے اعتبار سے خاصی اچھی حالت میں ہوتے ہیں۔

[2] یہ درحقیقت متوسط طبقہ میں سے قسمت کے چکر میں آئے ہوئے وہ لوگ ہوتے ہیں جو "طبیعت غزنوی اور قسمت ایازی" رکھتے ہیں، گھر چاہے کھانے کو کچھ نہ ہو لیکن لباس میں "تنزل" کا رنگ آنے نہیں دیتے۔ ان کے پاس اگر کچھ اندوختے نقد یا زیور کی شکل میں ہوں تو بھی وہ قدر نصاب سے کم رہتے ہیں۔

(۳) اس ۱۵ ابز آبادی کا ۱۵ بز = ۵۰۰ روپے تا ۱۰۰۰ فی کس روپے

(۴) " " " ۵ بز = ۱۰۰۰ " تا ۵۰۰۰ " "

گویا خانگی اندوختوں کی زکوٰۃ کل ۶ کروڑ افراد پر آسکتی ہے اور اوپر کے طبقاتی اندازۂ کنوز کے لحاظ سے زکوٰۃ کا حساب یوں بنے گا :-

طبقات	کل تعداد افراد	اندوختہ فی کس (اوسطاً)	زکوٰۃ فی کس (اوسطاً)	طبقہ وار مجموعی زکوٰۃ
اول	۳۰۰۰۰۰۰	۸ — ۱۳۵	۶ — ۳	۱۰۱۷۱۸۷۵۰ روپے
دوم	۱۸۰۰۰۰۰	۰ — ۳۵۰	۱۲ — ۸	۱۵۷۵۰۰۰۰۰ "
سوم	۹۰۰۰۰۰	۰ — ۳۵۰۰	۱۲ — ۱۸	۱۶۸۷۵۰۰۰۰ "
چہارم	۳۰۰۰۰۰	۰ — ۳۰۰۰	۰ — ۷۵	۲۲۵۰۰۰۰۰۰ "

میزان جملہ مقدار زکوٰۃ ۶۵۲۹۶۸۷۵۰ "

یہ ہوئے پینسٹھ کروڑ انتیس لاکھ اڑسٹھ ہزار سات سو پچاس روپے سالانہ۔

اب بنکوں، بیمہ کمپنیوں، اور حکومت کو دیے ہوئے قرضوں کا اندازہ زکوٰۃ کنوز کے سلسلہ میں کرنا رہ جاتا ہے، اور اس اندازہ کے لیے اعداد و شمار کی کئی وادیاں طے کرنی ناگزیر ہیں۔

رسائل و مسائل

نظامِ طاغوت اور سرمایہ دارانہ نظام کا فرق

سوال: طاغوتی نظام کی جو اصطلاح آپکے لٹریچر میں استعمال کی جاتی ہے، اس میں سرمایہ دارانہ نظام صنعت و تجارت بھی شامل ہے یا نہیں؟ نیز آپ جس طرح طاغوت کے قائم کردہ نظام حکومت و سیاست کی نوکریوں کو ناجائز ٹھیراتے ہیں کیا اسی طرح سرمایہ دارانہ اصولوں پر قائم ہونے والی فرموں اور کمپنیوں کی نوکری کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں یا نہیں؟ ــــ مثلاً سنگر سوئنگ مشین کمپنی یا ٹاٹا سٹیل فرم یا باٹا شو کمپنی وغیرہ۔ ان نظاموں میں فرق کیا ہے؟

جواب:۔ طاغوتی نظام سے ہماری مراد وہ نظامِ حکومت ہے جو حکم غیر اللہ کو خدا کی زمین پر جاری کرنے کے لیے قائم ہو۔ ایسے نظام کے قیام میں مددگار ہونا حرام ہے۔ رہا سرمایہ دارانہ نظام معیشت تو وہ طاغوتی نظام کی تعریف میں نہیں آتا بلکہ اسے فاسقانہ نظام کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اُس کی منظم معصیت اور اس کے حرام طریقوں نے انسانی معیشت کو انتہا سے زیادہ گندہ کر دیا ہے لیکن بہرحال اس کی خدمت کا گناہ طاغوتی نظام کی خدمت کے گناہ سے کم تر ہے ــــ اس لیے کہ یہ فاسقانہ نظام طاغوتی نظام ہی کے بل پر قائم ہے اور خرابیوں کی اصل جڑ طاغوتی نظام ہے۔ اگر ایک شخص ان دونوں نظاموں کی خدمت کے سوا کوئی تیسرا ذریعۂ معاش پا سکتا ہو تو اس کے لیے اس تیسرے ذریعے کا اختیار کر لینا لازم ہے۔ لیکن اگر کسی کے سامنے صرف ان دو میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا سوال درپیش ہو تو پھر اھون البلیتین یہی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے کسی ادارے میں نوکری کر لے۔ بشرطیکہ اسے براہ راست کسی حرام فعل کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، مثلاً

سود کی تفصیل یا اس کا حساب کتاب!

نظام باطل کو ٹیکس دینے اور اسکی ملازمت کرنے میں فرق

سوال:۔ طاغوتی نظام کے اندر رہتے ہوئے ایک شخص اس کی ملازمت پر مجبور ہوتا ہے اور ایک دوسرا شخص تجارت کرتے ہوئے ٹیکس ادا کرنے کی مجبوری میں مبتلا ہوتا ہے۔ کیا ان دونوں مجبوریوں میں کوئی فرق ہے؟ درانحالیکہ نظام طاغوت کو دونوں سے یکساں تقویت پہنچتی ہے۔ پھر کیا جس طرح ملازمت پر مجبور ہو جانے والے کو ملازمت سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔ اسی طرح کیا ٹیکس دینے والے تاجر کو ٹیکس دہندگی سے بچنے کے لیے اپنی تجارت کو کم نہیں کرنا چاہیے؟

جواب:۔ طاغوتی نظام کی اضطراری ملازمت ہو یا اسے ٹیکس دینا ہو، دونوں مجبوریوں میں محض مجبور ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں، البتہ اس پہلو سے فرق ضرور ہے کہ ایک مجبوری یعنی ملازمت سے آدمی کوشش کرے تو نکل سکتا ہے، مگر دوسری مجبوری سے اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک یہ نظام بدل نہ جائے۔

اگر کوئی شخص جائز طریقوں سے تجارت کرتا ہے اور اس سے اس کے منافع میں ترقی ہوتی ہے تو اس کا صرف اس لیے تجارت کو گھٹانے اور گرانے کی کوشش کرنا کہ موجودہ طاغوتی نظام کو ٹیکس نہ دینا پڑے، صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ ٹیکس سے بچنے کے ساتھ اپنی اس مالی طاقت کو بھی کم کرنے کا موجب ہوگا جس سے وہ موجودہ نظام کو صالح نظام سے بدلنے کی کوشش کر سکتا ہے ـــــ مگر یہ حکم صرف اس شخص کے لیے ہے جو واقعی صالح نظام کے قیام میں اپنی مالی قوت کو صرف کر رہا ہو اور اس کی معاشی جدوجہد محض اپنے عیش کو بڑھانے کے لیے نہ ہو۔

دونوں مجبوریوں میں ایک فرق اس لحاظ سے بھی ہے کہ ملازم تو نظام باطل کے قیام و نفاذ اور استحکام وارتقاء میں براہ راست حصہ لے رہا ہے، لیکن ٹیکس دینے والا تاجر اس قیام میں حصہ

لیتے نہیں جا رہا ہے بلکہ جو کوشش وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے اور نظام اسلامی کو تقویت دینے کے کر رہا ہے، اس میں سے نظام باطل بالجبر ایک حصہ لے اڑتا ہے۔

ہندو مسلم فسادات میں ہماری پالیسی

سوال:۔ جماعت کی طرف سے بہار ریلیف ورک کا جو آغاز ہو رہا ہے، وہ محض انسانی ہمدردی اور اعانت مظلوم کے جذبے کے تحت ہونا چاہیے۔ اور اس سلسلہ میں جو فیصلہ بھی کیا جائے اور جو قدم بھی اٹھے اس میں ہمارے پیش نظر "مسلمان قوم" کی خدمت نہ ہو، بلکہ ایسے کاموں کا جب بھی موقع پیش آئے تو انھیں ہندو مسلم کے امتیاز کے بغیر سرانجام دیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نواکھالی میں ہندو عنصر پر جو زیادتیاں کی گئی ہیں، ان کے پیش نظر نواکھالی میں تو ہم نے ریلیف کا کام شروع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن جب بہار کے مسلمانوں پر ظلم ڈھایا گیا تو ہم مسلمان مظلومین کی امداد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ آخر اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس امتیاز کا محرک مسلم قوم پرستی کا کوئی دبا چھپا اثر تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو یہ چیز بہت خطرناک مضمرات رکھتی ہے، اور اس سے نہ صرف یہ کہ غیر مسلم عناصر کو ہماری اصل حقیقت کے سمجھنے میں غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں گی، بلکہ خود جماعت کے اندر جہاں کہیں مسلم نیشنلزم کے کچھ بچے کھچے اثرات موجود ہوں گے، رفتہ رفتہ ابھرنے لگیں گے، اور ہماری جماعت ایک بین الانسانی جماعت ہونے کی بجائے مسلمانوں کی ایک قومی جماعت ہو کے رہ جائے گی۔

ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ بہار کے امدادی کام کے سلسلہ میں عموماً "مسلمان مظلومین" کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، حالانکہ ہمارا منصب محض "مظلومین" کی امداد کرنا ہے، چاہے وہ ہندو مظلومین ہوں یا مسلمان مظلومین! پھر کیا وجہ ہے کہ خاص طور پر "مسلمان مظلومین" کے الفاظ استعمال کیے جائیں؟

جواب :- ہماری جماعت جس دعوت کو لے کر کھڑی ہوئی ہے اس کا خطاب ساری انسانیت سے ہے اور اس دعوت کی فطرت سے جو اخلاق مناسبت رکھتا ہے وہ قوم پرستانہ اخلاق نہیں، بلکہ انسانی اور اسلامی اخلاق ہے۔ ان دونوں امور کو کسی موقع پر نظر انداز نہیں کیا گیا اور آئندہ بھی ہم انہیں کبھی نظر انداز نہ کریں گے۔

فسادات کے معاملہ میں ہم اپنی محدود طاقتوں کے ساتھ چار قسم کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ایک تو فساد کی علت العلل کو ختم کرنے کی سعی۔ دوسرے کسی مقام پر فساد کے پھوٹ پڑنے کو روکنا۔ تیسرے فساد پھوٹ پڑے تو اس کا مقابلہ کرنا۔ اور چوتھے کسی فساد زدہ رقبہ کے مظلومین کی حتی المقدور امداد کرنا۔ ان چاروں قسم کے فرائض کی ادائی میں کسی قسم کے قومی تعصب کو کوئی دخل نہیں ہے

جہاں تک فسادات کی علت العلل یعنی خدا کی ہدایت سے بے نیازی کا ازالہ کرنے کا تعلق ہے ہم مسلمان، ہندو اور دوسری ساری قوموں کو اپنا پیغام پہنچانے میں یکساں سرگرم ہیں۔ یہ بات البتہ ہمارے اختیارات سے باہر ہے کہ جس آسانی سے مسلمانوں کے حلقہ میں ہمارا پیغام سنا اور سمجھا جاتا ہے اس آسانی سے غیر مسلموں میں سنا اور سمجھا نہیں جاتا! تاہم ہماری دعوتی مساعی کسی امتیاز قومی کی روادار نہیں ہیں! بالکل اسی طرح کسی مقام پر اگر ہمارے اراکین موجود ہوں تو وہاں فساد کو پھوٹ پڑنے سے روکنے کے لیے جو پالیسی جماعت نے طے کی ہے وہ بھی مسلم اور غیر مسلم کی تمیز سے پاک ہے۔ ایسے موقعوں پر ہمارے کارکن جس طرح مسلمان عوام کو اسلامی اخلاق کے نام سے اپیل کرتے ہیں، اسی طرح غیر مسلم عوام کو بھی عام انسانی اخلاق کے نام سے اپیل کرکے فساد سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پھر جہاں تک ان کا بس چلتا ہے، دونوں ہی طرف کے سرخیل لوگوں سے مل کر فضا کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اگر ان کوششوں کے باوجود فساد پھوٹ پڑے تو جماعت نے ارکان کو جو پالیسی طے کرکے دی ہے وہ یہ ہے کہ ظالم چاہے ہندو ہو یا مسلمان اس کا مقابلہ جان لڑا کر کیا جائے اور مظلوم چاہے ہندو ہو یا مسلمان، اسے ظالموں سے بچانے کی پوری کوشش کی جائے۔ نیز پناہ مانگنے والے کو پناہ دی جائے، چاہے وہ کسی قوم کا فرد ہو! خود کوئی پیش دستی کسی

پڑنے کی جائے لیکن اپنے مال، جان اور آبرو کے بچاؤ میں کوئی بزدلی نہ دکھانی چاہیے۔ پھر جس جگہ فساد کی قیامت لوگوں کے سر سے گذر گئی ہو، وہاں اگر ہمارا کوئی رکن موجود ہو تو اس کا یہ فرض ہے کہ اپنی بساط کے مطابق وہ ستم رسیدہ عناصر کی خدمت اور ہمدردی پر کاربند ہو جائے:

ان مختلف مواقع کے فرائض میں کسی قومی امتیاز اور کسی قومی تعصب کے اثر انداز ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن یہ فرائض انھیں مقامات اور علاقوں میں انجام دیے جا سکتے ہیں جہاں ہمارے کچھ کارکن موجود ہوں۔ مقامی کارکن اپنے کام میں اگر بیرونی امداد کے محتاج ہوں اور جماعت کسی طرح کی بھی کوئی امداد انہیں فراہم کر سکتی ہو تو انھیں بیرونی امداد بھی بہم پہنچائی جائے گی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ کسی علاقہ میں کوئی کام مقامی کارکنوں کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نواکھالی میں کچھ نہ کر سکے۔ نواکھالی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں ہماری آواز بالکل نہیں پہنچی ہے۔ نہ وہاں کوئی رکن جماعت ہے، نہ کوئی ہمدرد اور نہ ہماری دعوت سے کسی کے کان آشنا ہیں۔ پھر وہاں اردو زبان بھی نہیں سمجھی جاتی اور ہمارا کوئی کارکن ایسا نہیں ہے جو اس علاقے میں جا کر کام کر سکتا ہو۔ اگر ہم بطور تکلف ادھر ادھر سے چند کارکن وہاں بھیج دیتے تو ان کا جانا درحقیقت بالکل بے کار رہتا ــــ ہمیں محض نمائش اور اشتہار بازی تو کرنی نہ تھی کہ چند آدمیوں کو وہاں بھیج کر ملک میں ڈھنڈورہ پیٹ دیتے کہ دیکھیے ہم نے نواکھالی میں کام کیا ہے!

نہ صرف یہ کہ خود نواکھالی میں ہمارا کوئی رکن یا ہماری کوئی مقامی جماعت نہیں ہے، بلکہ بنگال بھر میں جماعت کی کوئی ایک مضبوط شاخ بھی موجود نہیں اور نہ منفرد ارکین کی کوئی بڑی تعداد ہی پائی جاتی ہے، جسے جمع کر کے کوئی کام کیا جا سکتا۔ اس وجہ سے نواکھالی کے معاملہ میں ہمیں مجبوراً صبر کرنا پڑا۔ بخلاف اس کے، بہار میں ہماری جماعت کا خاص اثر موجود تھا، خود شہر پٹنہ میں مقامی جماعت موجود تھی اور صوبہ کے بعض دوسرے شہروں میں بھی مقامی جماعتیں بن چکی تھیں۔ نیز منفرد ارکان اور ہمدردوں کا بھی ایک اچھا خاصا حلقہ صوبہ میں پھیلا ہوا تھا۔

بس ان مقامی کارکنوں کی مجموعی طاقت کو ذریعۂ کار بنا لیا گیا اور ان کو جس حد تک ہم باہر سے مدد دے سکتے تھے، دی جا رہی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ ہمارے مظلومین کے لیے "مسلمان مظلومین" کے الفاظ کیوں استعمال کیے جاتے ہیں، سو اس کے جواب میں، اول تو یہ واضح رہے کہ جماعت کے کسی سرکاری مراسلہ یا مجلس شوریٰ کے کسی فیصلہ میں تو یہ چیز نہیں پائی جاتی۔ ہاں عام طور پر ذاتی خطوط یا شخصی گفتگوؤں میں ایسا کہا جاتا ہوگا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اگر کسی جگہ فی الواقع مسلمان ہی مظلوم ہوں تو انھیں "مسلمان مظلومین" کہنے میں کونسا گناہ ہے؟ واقعہ کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کر دینے کے بجائے کسی معاملہ میں ایک بناوٹی طرز کلام اختیار کرنا اور اس پر خواہ مخواہ کی احتیاطی پابندیاں لگانا ان لوگوں کا کام ہے جن کے دل میں "چور" ہوتا ہے۔ ہم جب اپنے اصول میں مخلص ہیں تو ہمیں ہندو کو ہندو اور مسلمان کو مسلمان کہنے میں کیا باک ہے؟ آخر ہم کوئی متحدہ قومیت تو پیدا کرنے نہیں اٹھے ہیں کہ ہندو اور مسلمان کے الفاظ استعمال کیے جائیں، تو یہ متحدہ قومیت ڈھ جائے گی!

اسی سلسلہ میں ایک بات اور بھی ملحوظ رکھیے، اور وہ یہ ہے کہ اصول و مقصد کا بین الانسانی ہونا اور ہماری دعوت کا غیر قومی ہونا ہمیں یہ بہرحال نہیں سکھاتا ہے کہ مسلمان قوم سے ہمیں کلی مقاطعہ کرنا چاہیے۔ آخر جس قوم کے درمیان ہم پیدا ہوئے اور پلے ہیں اور جس کے ساتھ ہمارا رہن سہن ہے، اس سے ہمارا تعلق فطری تعلق ہے اور اس فطری تعلق کا اگر ہم تکلفاً انکار بھی کریں تب بھی یہ واقعتہً موجود رہے اور موجود ہی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے ہم پر بعض ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ یہ گویا ہمارا ایک مشترک کنبہ ہے اور اس کنبے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا ہمارا ایک فطری فرض ہے۔ اس کنبے پر اگر کوئی مصیبت کا دور آئے گا تو ہمیں بہرحال اس کے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر اس کا بچاؤ کرنا ہوگا، ہمیں اسے منظم رکھنا ہوگا، اور ہمیں ان کے ساتھ ان ساری حفاظتی سرگرمیوں میں شریک رہنا ہوگا جو ہمارے اصول اخلاق کی حدود کو نہ پھاندتی ہوں اور اگر وہ ان

حدود کو پھاندتی ہوں تو ہمارا کام یہ بھی ہے کہ ہم انھیں پابند حدود بنا دیں۔

البتہ عام طور پر جو نیشنلزم دنیا بھر میں اور خود ہندوستان میں، بلکہ مسلمانوں میں پھیلا ہوا ہے اس کے اثر سے بہر حال ہمارے سینے پاک ہیں۔ نیشنلزم جو اصول پیش کرتا ہے وہ ہمارے اصول کی عین ضد ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ تمھاری قوم اگر بھلائی کرے تو بھی اور برائی کرے تو بھی تم اس کا ساتھ دو۔ مگر ہمارا اصول یہ کہتا ہے کہ تمھاری قوم اگر بھلائی کرے تو تم اس کا ساتھ دو اور برائی کرے تو نہ صرف یہ کہ اس کا ساتھ نہ دو، بلکہ یہ بھی لازم ہے کہ برائی سے اس کا ہاتھ روکنے کی کوشش کرو۔ یہی ہم کرنا چاہتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ لیکن ہم اس غیر فطری اصول پسندی کو صحیح نہیں سمجھتے جس کا تقاضا یہ ہو کہ اپنی قوم کی مصیبتوں پر ہم الگ بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ موقع پا کر کوئی وعظ کہہ دیں۔

خصوصیت سے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہی گروہ ہماری دعوت کا اولین مخاطب ہے۔ اس کا ذہن آسانی سے ہماری بات سن سمجھ سکتا ہے اور دوسروں کے قریب آنے سے پہلے یہی ہمارے قریب آسکتا ہے اور یہی سب سے زیادہ سپاہی تحریک حق کے لیے فراہم کرنے والا ہے پس اس گروہ سے ہمارا جو قریبی تعلق ہے، کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کا زبان سے انکار کریں یا عملی رویہ تجویز کرنے میں اسے نظر انداز کر دیں۔ یا اس کی وجہ سے جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں ان کو پورا کرنے سے گریز کریں۔

نماز اور اذان اردو زبان میں

سوال :۔ نبی صلعم چونکہ عربی تھے اور اہل عرب کی طرف آپ کی بعثت بالخصوص تھی، اس وجہ سے یہ امر تو بالکل فطری تھا کہ خدا کی ہدایت عربی زبان میں نازل ہو اور پہلے اہل عرب کو متاثر کیا جائے اور پھر یہ دوسری زبانوں کے ذریعے دعوت حق کو دوسری قوموں تک پہنچائیں۔ لیکن نماز کی زبان کا ساری دنیا کے لیے عربی مقرر ہو جانا معلوم نہیں کیا

کس بنا پر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غیر زبان میں جو نماز پڑھی جاتی ہے اس میں نہ تو مطالب کلمات سہولت سے پیش نظر رہ سکتے، نہ نمازی کا تاثر گہرا ہو سکتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ عجمی زبانوں میں نماز پڑھنے کی ممانعت نہ ہونے کے باوجود، عربی زبان میں نماز پڑھنے کی عادت امت نے اختیار کر رکھی ہے۔ پھر نماز ہی نہیں، جمعہ کا خطبہ تک عربی زبان میں دیا جانا ضروری ہو گیا ہے حالانکہ اس سے عوام کی تعلیم و تذکیر کا جو کام لیا جانا مقصود ہے۔ وہ اس پابندی کی وجہ سے انجام نہیں پاتا۔ علیٰ ہذا القیاس اذان کا معاملہ بھی ہے، مجھے بتایا جائے کہ آخر اذان اگر اردو میں کہی جائے تو اس میں کیا چیز مانع ہے؟

جواب: - جہاں تک نماز کا تعلق ہے اس کے معاملہ میں تو شروع سے آج تک تمام امت کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ نماز انہیں الفاظ میں ہونی چاہیے جن کی نبی صلعم نے تعلیم فرمائی ہے اور ویسے بھی نماز کا سب سے اہم جز تلاوت قرآن ہے اور قرآن کا اطلاق اس کے ترجمہ پر نہیں ہو سکتا بلکہ صرف انہیں الفاظ پر ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں۔ رہی اذان تو اس کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے اور کوئی صاف حکم اس بات کا موجود نہیں ہے کہ اذان عربی زبان ہی میں ہو لیکن ہر قوم کی زبان میں اذان الگ الگ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں بھی وہی (Nationalization of church) یعنی مذہب کو قومی بنا دینے کی بیماری پیدا ہو جائے۔ جو لوتھر کی تحریک کی وجہ سے یورپ میں پیدا ہوئی۔ اور جس کی وجہ سے ایک مذہب ہونے کے باوجود یورپ کی قومیں ایک دوسرے سے پھٹ کر باہم دشمن بنی چلی گئیں۔

اگر اردو زبان میں کوئی شخص اذان دے رہا ہو تو خود ہندوستان ہی کے باشندوں میں بہت سے آدمی ایسے ہوں گے جو اس کو سن کر یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ اذان ہو رہی ہے۔ مثلاً بنگالی مالاباری وغیرہ۔ یہ چیز بیرون اسلام کو جمع کرنے والی نہیں بلکہ پھاڑ دینے والی ہے۔ اسی بنا پر خطبہ جمعہ میں بھی ہماری رائے یہ ہے کہ افہام و تفہیم کے لیے اگر اس کا ایک حصہ قومی زبان میں ہو تو اس کے ساتھ ہی ایک حصہ لازماً عربی زبان میں بھی ہونا چاہیے تاکہ جمعہ کا خطبہ اور نتیجۃً خود نماز جمعہ

ایک قوم کے لیے خاص ہو کر نہ رہ جائے۔

نوٹوں اور سکوں کی زکوٰۃ

سوال:۔ (۱) بعض اہل علم کا زکوٰۃ کے معاملہ میں مسلک یہ ہے کہ نقدین (سونا چاندی) پر جو زکوٰۃ عائد ہوتی ہے اس سے نوٹ اور ادنیٰ دھاتوں کے سکے مستثنیٰ ہیں، اور کوئی وجہ نہیں کہ انھیں نقدین میں شمار کیا جائے۔ نوٹ ایک کاغذ ہے اور سکے ایسی دھاتوں کی ٹکیاں ہیں جو زکوٰۃ سے مستثنیٰ رکھی گئی ہیں۔ پس ان کی قیمت کسی وجہ سے چاہے کچھ ہی قرار پا جائے ان سے زکوٰۃ نکالنا کسی نص کے تحت لازم نہیں قرار پاتا۔ نوٹ اور سکے دوسرے ضروری سامانوں اور برتنوں کی طرح ضروریات زندگی میں سے ہیں، اور بس!

(۲) اگر بالفرض یہ مانا جائے کہ نوٹوں اور ادنیٰ دھاتوں کے سکوں پر زکوٰۃ عاید ہوتی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا حساب سونے کے تحت کیا جائے گا یا چاندی کے نصاب کے تحت؟ کیونکہ یہ نہ سونے کی تعریف میں آتے ہیں، نہ چاندی کی تعریف میں؟

جواب:۔ اصل میں ان حضرات کو ساری غلط فہمی اس مسئلہ میں محض نوٹ اور سکے کی ماہیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ نوٹ اور سکہ محض کاغذ یا دھات کا ایک ٹکڑا ہونے کی وجہ سے اپنے اندر جو "قدر" رکھتا ہے، وہ اس کے نوٹ یا سکہ قرار پاتے ہی کالعدم ہو جاتی ہے جو اس کی جنسی قدر سے بہر حال زیادہ ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ "قدر" کیا حیثیت رکھتی ہے؟ دراصل کاغذ یا دھات کا یہ تغیرِ قیمت نوٹ یا سکہ بن کر چاندی سونے کی قائم مقامی کرنے کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ ایک روپے کے سکے یا ایک روپے کے نوٹ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک روپے کے سونے یا چاندی کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے، اور جس شخص کی ملکیت میں ایک روپے کا نوٹ یا سکہ ہو وہ دراصل ایک روپے کے سونے یا چاندی کا مالک ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر مارکیٹ میں اسے ایک روپے کے نوٹ یا سکے کے بدلے میں کسی شے کی یا کسی طرح کی محنت

کی وہ مقدار حاصل ہو سکتی ہے جو اتنی مالیت کی چاندی یا اتنی مالیت کے سونے سے حاصل ہونی چاہیے تھی۔ علاوہ بریں اسے اپنے نوٹوں اور سکوں کے عوض ہر وقت مارکیٹ سے بھی اور سکے اور نوٹ جاری کرنے والی حکومت کے خزانہ سے بھی مقررہ مالیت کا سونا چاندی مل سکتا ہے۔ سکہ اور نوٹ تو حکومت کی طرف سے اس بات کی رسید یا سند ہے کہ اس کا مالک اتنی مالیت کے سونے چاندی کا مالک ہے اور حکومت ہر وقت اس مالیت کا سونا چاندی دینے پر تیار ہے، اور حکومت ملک بھر کے لیے یہ لازم ٹھیراتی ہے کہ وہ اس سکے اور نوٹ کے بدلے میں وہ سب کچھ ادا کرے جو اس کی قوت خرید (Purchasing Value) کی رو سے منڈی کے نرخوں پر ادا ہونا چاہیے۔

اب آپ نوٹ اور روپے کو بالکل چاندی سونے کی طرح چاندی سونے کی جگہ ہر کام میں استعمال کرتے ہیں، اجرتیں اسی سے لیتے دیتے ہیں، خرید و فروخت اسی سے کرتے ہیں، قیمتوں کا اندازہ اسی سے باندھتے ہیں، اور ان سارے کاموں میں آپ نوٹ کو کاغذ کا ایک پرزہ اور سکے کو دھات کی ایک ٹکی مان کر اور اسی لحاظ سے اس کی قیمت مقرر کر کے معاملہ نہیں کرتے، بلکہ نوٹوں اور سکوں کو بالکل چاندی سونے کی حیثیت سے لیتے دیتے ہیں، لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ جب اللہ کا حق ہی ادا کرنے کا موقع آئے تو آپ یہ عذر فرمادیا کریں نوٹ تو کاغذ کے پرزے ہیں اور یہ سکے تو ادنیٰ دھاتوں کے ٹکڑے ہیں، ان پر اللہ میاں زکوٰۃ کیسے لگانے لگے، اُن کا حق تو صرف سونے چاندی کے ذخائر پر عائد ہوتا ہے!

نوٹوں اور سکوں کا مالک دراصل چاندی اور سونے ہی کا مالک ہوتا ہے، اور حکومت کے ایک انتظام کے تحت وہ چاندی سونا اٹھائے پھرنے سے بچ کر سونے چاندی کی ملکیت کی سندوں اور رسیدوں کے ذریعے سارے کام چلاتا ہے، اس کے "نقدین" حکومت کے پاس جمع رہتے ہیں اور وہ ان کے ہم قدر "مصنوعی نقدی" حکومت سے حاصل کر لیتا ہے اور یہ مصنوعی نقدی "نقدین" کی سو فیصدی قائم مقامی کرتی ہے۔ اس وجہ سے اس مصنوعی نقدی یعنی نوٹوں اور سکوں پر شریعت بھی نقدین کا حکم لگائے گی اور ان میں سے اللہ کا حق طلب کرے گی۔

(۲) رہا دوسرا سوال سو ہندوستان میں چونکہ معیار زر چاندی کو مقرر کیا گیا ہے اور تمام سکوں

اور نوٹوں کی قیمت یا ان کی قوت خرید چاندی ہی کے معیار پر مقرر کی جاتی ہے اور ان کے بدلے میں حکومت چاندی ہی ادا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس لیے ہندوستان میں نوٹوں اور سکوں کی زکوٰۃ نکالنے کے لیے چاندی ہی کا نصاب ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ہاں جن مغربی ممالک میں "معیار زر" طلا ہے ان میں نوٹوں اور سکوں کی زکوٰۃ سونے کے نصاب سے محسوب ہوگی۔

کیا نظامِ طاغوت اطاعت کا مستحق ہے؟

سوال:۔ (۱) اگر یہ درست ہے کہ "خدا بادشاہِ زمین و آسمان ہے، وہ زمین پر کسی اور کی بادشاہی کس طرح تسلیم کر سکتا ہے" تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے "جالوت" کو کیوں حکمرانی عطا کی (واللہ یوتی ملکہ من یشاء)۔ اور فرعون کو کیوں مصر ایسا زرخیز ملک عطا کیا جیسا فرعون کہتا ہے کہ الیس لی ملک مصر؟

اگر یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے احکام کی اطاعت کا مطالبہ کرنے کے بعد اپنے بندوں کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ان حاکموں کی اطاعت بھی کی جائے جو اس کی سند کے بغیر حکومت جماتے ہیں اور اس کے حکموں کے خلاف حکم دیتے ہیں تو پھر یہ واضح ہونا چاہیے کہ وہ ایسے حاکموں کو اس کا موقع ہی خود کیوں دیتا ہے کہ غلط حکومتیں قائم کریں؟ یہ صورت تو وہی ہوئی کہ

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ | بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

خود ہی "بے سندوں" کو حکومت سے نوازنا اور پھر بے بس رعایا سے یہ مطالبہ کرنا کہ ان کی اطاعت نہ کرو دونوں متضاد باتیں ہیں۔ میری رائے میں تو تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء سے بڑا سرٹیفکٹ ان کی اطاعت کو لازم کرنے والا اور کیا ہو سکتا ہے! یہ بات بھی اسی رائے پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون کو فرعون سے خطاب کرتے ہوئے آداب شہنشاہی کی پابندی کرنے کا حکم قولا لہ قولا لینا کے الفاظ میں دیا گیا تھا۔۔۔ کہ خبردار

بے ادبی نہ ہونے پائے۔

مزید یہ کہ فرمانروایانِ وقت کی اطاعت کا نظریہ بغاوت اور فساد کا موجب ہوتا ہے حالانکہ واللہ لا یحب الفساد اور لا تفسدوا فی الارض کی رو سے مسلمان کے لیے امن پسند رہنا لازمی ہے۔

جواب:۔ (۱) یہ سوال نتیجہ ہے خدا کی مشیت اور اس کی رضا کے فرق کو نہ سمجھنے کا۔ آپ تو فرعون اور جالوت کی بادشاہی پر غور کر رہے ہیں، اصل جڑ کو لیجیے کہ خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا اور جب شیطان کو خود ہی پیدا کیا اور اسے اختیار دیا تھا کہ وہ انسانوں کے قلوب پر اپنا اثر ڈالے اور نفوس کے اندر نفوذ کرے تو پھر غریب انسان سے یہ مطالبہ کیوں کیا کہ وہ شیطان کا اثر قبول نہ کرے؟ ــــ اور اب جب کہ اس نے شیطان کو پیدا کیا ہے اور انسان پر اثر ڈالنے کا اسے موقع دے دیا ہے تو پھر آدمی کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ شیطان کا احترام اور اس کی اطاعت کرے۔ مگر یہ گتھی قرآن نے بہت اچھی طرح سلجھا دی ہے۔ آپ اگر قرآنی فلسفہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان خیر اور شر کے دو گونہ محرکات کے درمیان ایک محدود اختیار کے ساتھ مقامِ آزمائش میں کھڑا ہے۔ وہ خدا کی اطاعت بھی کر سکتا ہے اور اس سے انحراف کر کے فرعون اور جالوت کے آگے بھی سرِ تسلیم خم کر سکتا ہے، اور چاہے تو خود فرعون اور جالوت بن سکتا ہے۔ اور اس کا امتحان اس میں ہے کہ وہ کونسا رویہ اختیار کرتا ہے؟ وہ جو حق و عدل کا رویہ ہے یا وہ جو ظلم و باطل کا رویہ ہے؟ بس اسی پر جزا و سزا کا دار و مدار ہے۔

خدا کی مشیت نے دونوں راستے کھلے رکھے ہیں۔ وھدینٰہ النجدین۔ انسان جس راستے پر بھی چلے گا خدا کی مشیت ہی کے تحت چلے گا۔ مگر خدا کی رضا یہ نہیں ہے کہ وہ بغاوت اور معصیت کی راہ پر چلے۔ اس کی رضا یہی ہے کہ وہ اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جو اس نے اپنی شریعت سے بنا دی ہے۔ اگر خدا کی مشیت نے بالجبر انسان کو شر اور فساد کے راستہ سے روک کر خیر اور صلاح کے راستہ پر چلایا ہوتا اور نہ شیطان کا وجود ہوتا، نہ بدی کے محرکات ہوتے، نہ غلطی کے امکانات، تو پھر انسان کا اپنا کارنامہ کیا ہوتا، خود اس نے کونسی جد و جہد دکھائی ہوتی، خود اس نے کہاں عقل لڑائی ہوتی، اس نے

بدی کی طاقتوں کے خلاف کونسی قوت صرف کی ہوتی اور نیکی کی حمایت میں کونسی قربانیاں کی ہوتیں کہ وہ کسی جزاء کا مستحق ہوتا اور اس میں اور درختوں اور پتھروں میں کونسا فرق باقی رہ جاتا؟ اختیار کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ انسان انبیاء کی پیروی کرنے پر بھی اور شیاطین کے پیچھے چلنے پر بھی قادر ہو، وہ خدا کی بندگی و اطاعت میں یکسو بھی ہو سکے اور خدا سے روگردانی کر کے فراعنہ اور نمارده کی غلامی اور پرستش بھی کر سکے، وہ اپنی قوت سے برائی کو بھی غذا دے سکتا ہو اور بھلائی کی آبیاری بھی کر سکتا ہو، وہ اپنی زندگی کی پونجی رضائے الٰہی کی خریداری میں بھی صرف کر سکے اور اسے خواہشوں کے قمار خانے میں بھی اڑا سکے — پھر اس اختیار اور آزادی کو پا کے وہ اپنے ارادہ کے ساتھ جس طرز کی زندگی کو اپنے لیے پسند کرے اس کے مطابق اسے جزا و سزا ملنی چاہیے۔

یہ عجیب طرح کی رائے ہے کہ حکومت باطل کا اتباع بھی ویسا ہی جائز بلکہ لازم قرار دیا جائے جیسا حکومت حق کا اتباع ہونا چاہیے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ خیر و شر میں سرے سے کوئی وجہ امتیاز باقی ہی نہ رہی۔ فرعون کی حکومت اور موسیٰ علیہ السلام کا نظام اسلامی، نبی صلعم کی مدنی ریاست اور قیصر و کسریٰ کی بادشاہتیں، چونکہ سب اللہ ہی کی مشیت سے وجود میں آئی تھیں لہٰذا ان میں سے جس کی بھی اطاعت کی گئی، اللہ کو کوئی شکایت نہیں اور جس کے خلاف بھی بغاوت اٹھائی گئی، اللہ کے ہاں ایسی بغاوت پر عتاب ہوگا۔ کیا بہتر نہ ہوگا کہ اس فلسفہ کو اور زیادہ پھیلایا جائے اور فارمولا یہ بن جائے کہ انسان شیطان کا اتباع کرے یا انبیاء کا، اعلیٰ اخلاق کی پابندی کرے یا سفلی خواہشات کی، حق پسند ہو یا باطل پرست، اسلام پر کاربند ہو یا کفر پر، بات ایک ہی ہے۔

آپ کی غلط فہمی یہ ہے کہ آپ نے مہلت اور ڈھیل کو اجازت اور اباحت کا ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ یعنی یہ کہ چونکہ فرعون اور جالوت کو اس امر کا موقع خود اللہ ہی نے دیا تھا کہ وہ بادشاہت جمائیں اور لوگوں سے اپنی اطاعت کرائیں، اس وجہ سے از خود انھیں اس کی طرف سے آئینی اجازت بھی اس کی حاصل ہے ورنہ چاہیے یہ تھا کہ جہاں کسی کا قدم حدود بندگی سے آگے بڑھتا اور خدا کی رضا کے خلاف قانون سازی کی جاتی تو فوراً فرشتے اگر اس کو جکڑ لیتے اور اٹھا کر جہنم میں ڈال دیتے۔ حالانکہ عالم انسانی کا نظام ڈھیل کے جس قانون پر چل رہا ہے وہ اباحت کا ہم معنی نہیں۔ مراد یہ کہ یہاں ایک چور کو چوری کی مہلت حاصل ہے

قاتل کو قتل کی قوت میسر ہو جاتی ہے، شرابی کو شراب پینے کے مواقع ملتے ہیں، زانی کو زنا کی گنجائش ہاتھ آتی ہے، اور کافر کو نظامِ کفر کو استوار کر لینے کی قوت مل جاتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ڈھیل قانون کے تحت ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ چوری کرنا، قتل کرنا، زنا کرنا یا کافرانہ حکومتوں کو بنانا اور چلانا اور ان کی اطاعت کرنا قانونِ الٰہی اور حکومتِ الٰہی کی نگاہ میں جائز و مباح ہیں۔ خدا نے ہر گناہ کے لیے ڈھیل ضرور دی ہے مگر اجازت کسی گناہ کی نہیں دی، اجازت صرف نیکی کرنے کی دی گئی ہے۔ اس ڈھیل کا صحیح استعمال یہ ہے کہ اسے صرف جائز امور میں صرف کیا جائے اور ناجائز امور سے پرہیز کیا جائے، ورنہ جب یہ ڈھیل ختم ہو جائے گی تو انسان کو اپنے عمل کی فطری جزا و سزا کا خیر مقدم کرنا ہوگا اور جس نے خدا کے قانونِ حرمت و اباحت کو نظر انداز کر کے ڈھیل اور مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہوگا وہ عذابِ الٰہی میں پکڑ لیا جائے گا۔ زندگی کی یہ کھیتی جو اللہ نے انسان کے سپرد کی ہے، کانٹے بھی اگا سکتی ہے اور پھول بھی، انگور بھی اس میں بوئے جا سکتے ہیں اور تھوہڑ بھی۔ خیر کی تخم ریزی کرو تو بھی یہ اسے قبول کرتی ہے اور شر کے بیج ڈالو تو بھی یہ انھیں لینے سے انکار نہیں کرتی مگر اس کے اصل مالک نے انسان کے لیے لازم یہی ٹھیرایا ہے کہ وہ صرف خیر کی کاشت کرے اور شر کی فصل اس کھیتی میں نہ بوئے — ورنہ جو کچھ بویا جائے گا وہ کاٹنا بھی ہوگا۔

قولاً لیناً کے معنی آدابِ شہنشاہی کو برقرار رکھنے کے نہیں لیے جا سکتے۔ معلوم نہیں یہ غلط فہمی آپ کو کس وجہ سے ہوئی ہے۔ "لینۃ" خشونۃ کی ضد ہے اور اس کے معنی نرمی اختیار کرنے کے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو ان الفاظ کے ساتھ جو ہدایت دی گئی تھی وہ دراصل اسلام کی حکمتِ تبلیغ کا ایک مستقل اصول ہے، یعنی مبلغ کو نرمی اور حسنِ کلام سے بات کرنی چاہیے، اور مخاطب کو جذباتِ نفرت و تشدد کے مظاہرہ سے اشتعال دلا کر فرار عن الحق پر آمادہ نہ کر دینا چاہیے، ورنہ کیا کسی مومن کے دل میں یہ تصور بھی سما سکتا ہے کہ فراعنہ اور نماردہ کے درباروں میں رکوع و سجود اور حمد و ثنا کرنے اور عاجزی اور سرافگندگی اور تذلل کی نمائش کرنے اور "حضور والا جاہ" — "بندہ پرور" — "خداوند ولی نعمت" جیسے الفاظ سے بات کرنے کے جو شرک آمیز آداب مروج ہیں ان کی پابندی

کے لیے خود خدا اپنے اخص الخواص بندوں کو حکم دے۔ خود قرآن ہی میں دیکھیے کہ اس "قولاً لیناً" پر عمل کرتے ہوئے خدا کے پیغمبر نے دربار فرعون میں کیا کہا اور کیسے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے کہنے کی بات یوں متعین فرمادی تھی کہ فقولا انا رسولا ربک فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبھم قد جئنٰک بایۃ من ربک والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔ پھر جشن کے دن کو فرعون سے معرکہ کا دن ٹھیرا کر جب پھر گیا تو حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ ویلکم لا تفتروا علی اللہ کذبا فیسحتکم بعذاب وقد خاب من افتریٰ۔ یہ باتیں بالکل سیدھی سادی ہیں اور ان میں "حضور" اور "جناب" کے الفاظ کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور ان میں "فدویت" کی کوئی اسپرٹ نہیں پائی جاتی، بلکہ بات کا انداز بالکل ویسا ہے، جیسے سیدھے سیدھے معاملات میں سیدھی سیدھی گفتگو کی جاتی ہے۔ ذرا اور آگے اسی سورۂ طٰہٰ میں ملاحظہ ہو کہ موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لانے والے درباری مداری کس طرح یکایک باغیانہ اور بےلاگ جذبات اسلام سے مالامال ہو جاتے ہیں۔ فرعون انھیں قید اور سولی اور قطع احضا کی سزاؤں سے ڈراتا ہے لیکن وہ پورے نافرمان بن کر کہتے ہیں لن نؤثرک علیٰ ماجاءنا من البینٰت والذی فطرنا فاقض ما انت قاض انما تقضی ھذہ الحیوۃ الدنیا۔۔۔ کیا آدابِ شہنشاہی کو برقرار رکھنے کے ڈھنگ یہی ہوتے ہیں کہ فرعون کے حکم کو ٹھکرانے کا صاف صاف اظہار کر دیا جائے۔ یہ تو ایک نبی پر ایمان لانے والے مومنوں کا مقام ہے۔ پھر کیا نبی کا مقام آپ اس سے بھی پست کرنا چاہتے ہیں؟

باطل کا اقتدار اور طاغوت کا غلبہ مٹانے کے لیے جو جنگ لڑی جاتی ہے اس کا نام قرآن نے جہاد رکھا ہے اور اسے سب سے بڑی عبادت قرار دیا ہے۔ اسے فساد فی الارض سے تعبیر کرنا اسلامی نظریہ صلاح و فساد سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اسلام کے نزدیک فساد صرف اس حالت کا نام ہے جس میں انسان اپنے خدا کی ہدایت سے ہٹ گیا ہو اور فساد یہ ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کی ہدایات پر چلنے سے روکا جائے اور غیر اللہ کے آئین کی پابندی پر مجبور کیا جائے۔ چاہے بظاہر ہر طرف سکون ہی سکون ہو اور کوئی معرکۂ جنگ کہیں عملاً برپا نہ ہو، نہ چوری اور لوٹ اور قتل کا کوئی ایک واقعہ بھی

منو دار ہو رہا ہو۔ اسی طرح اسلام کی نگاہ میں صلاح صرف اس حالت کا نام ہے کہ انسان پوری زندگی خدا کی ہدایت کے تحت بسر کر رہا ہو اور اس سے روکنے اور غیر اللہ کی غلامی پر مجبور کرنے والی کوئی قوت برسرِ عمل نہ ہو، چاہے اس حالت کے پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے معرکہ ہائے جنگ بار بار کیوں نہ برپا ہوں اور عوام کو اس سلسلہ میں کتنی ہی پریشانیوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس نظریۂ صلاح و فساد کے تحت بہت سے وہ لوگ جو اعلیٰ درجہ کے شرفا سمجھے جاتے ہیں درحقیقت اشرار میں شمار ہوں گے اور بہت سے امن پرور مفسدین قرار پائیں گے، دوسری طرف بہت سے وہ ہاتھ جو تلوار سونتے ہوں گے اور انسانی خون سے رنگین ہو رہے ہوں گے، امن پھیلانے والے ہاتھ سمجھے جائیں گے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر نظامِ حق کی اطاعت امن پروری ہے تو پھر ہر امن پرور کا فرض ہے کہ وہ نظامِ باطل کے خلاف بغاوت کرے۔ اس کا نام افساد فی الارض نہیں ہو سکتا۔

ایک ضروری تصحیح

ترجمان القرآن کے گزشتہ پرچے (جلد ۳۰ - عدد ۳) میں رسائل و مسائل کے باب میں جو سوالات و جوابات شائع ہوئے ہیں، ان میں سے حسب ذیل کو سہواً مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

۱۔ بہار کا خونی حادثہ اور مسلمان۔ ۲۔ خدا کی صفت خلق کی حقیقت

۳۔ شیطانی وساوس ۴۔ عصمت کی حفاظت کے لیے خودکشی

۵۔ موجودہ ہڑتالیں اور حق پسند مسلمان۔

ان عنوانات کے تحت سوالات کے جو جوابات درج ہیں وہ میرے قلم سے ہیں۔ رسالہ کی فہرست میں تصحیح کر لی جائے۔ (نعیم صدیقی)

مطبوعات

اسلام کا نظامِ حیات

مؤلفہ جناب عبد الوہاب صاحب ظہوری۔

شائع کردہ: نفیس اکیڈمی، عابد روڈ، حیدر آباد، دکن۔ قیمت :- مجلد معہ گرد پوش ۴ روپے ۴ر

مولف نے یہ کتاب "المثل الکامل" (از محمد احمد جاد مولیٰ بک) کے ایک باب کو پھیلا کر مرتب کی ہے اور نظامِ اسلامی کے مختلف شعبوں کی معلومات اس حد تک اس میں سمیٹی گئی ہیں کہ اوسط درجہ کی ذہانت رکھنے والے طبقہ کے ذوق کو تسکین دے سکیں۔ اس خاص طبقہ کے لیے یہ کتاب خاصی اچھی ہے۔ بالخصوص اسلام اور اسلامی نظام کا نام لینے والے نوجوان جنھیں اسلام سے غیر شعوری روایتی دلچسپی تو ہے مگر اس کا ابتدائی علم بھی نہیں رکھتے، اس کتاب کے ذریعے دینِ حق کی ایک جھلک نگاہِ شعور سے دیکھ سکتے ہیں۔

مگر یہ کتاب اسلام کے موضوع پر شائع ہونے والے لٹریچر کے جس سیلاب کی ایک موج ہے، اس کا معیار ابتدا سے پست رہا ہے۔ عام طور پر ہمارا "اسلامی لٹریچر" مطالعہ و تحقیق اور فکر و نظر کے کم سے کم صرف سے تیار کیا جا رہا ہے، حالانکہ دورِ جدید کی مخصوص علمی فضا میں اسلام کو پیش کرنے کے لیے بہت دماغ سوزی کی ضرورت ہے۔ ایک اور کمی ہمیں یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ یہ ساری مہم "کتاب سازی" کی ایک مہم بنتی جا رہی ہے مگر اپنے ساتھ کوئی اسلامی انقلابی تحریک نہیں رکھتی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے لکھنے والے فکر و نظر کے نئے نئے زاویوں سے اسلام کے نظام پر گہری نگاہ ڈالیں اور پھر جو کچھ پیش کریں اُسے اس ایمانی زور کے ساتھ پیش کریں جو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایک عملی اسلامی انقلاب کو نمودار کر دے۔

جماعت اسلامی کے اجتماعات

اس سے پہلے اعلان کیا گیا تھا کہ جماعت اسلامی کا تیسرا اجتماع عام ۴، ۵، ۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو پٹنہ صوبہ بہار میں منعقد کیا جائے گا مگر اس کے بعد صوبہ پنجاب اور صوبہ سرحد اور بہار میں فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی وجہ سے شمالی ہندوستان کے بیشتر رقبے میں ابتری پھیل گئی۔ ذرائع آمد و رفت بیشتر منقطع اور بقیہ پرخطر اور غیر محفوظ ہو گئے۔ اور جہاں فساد بالفعل واقع نہیں ہوا وہاں کے حالات بھی پرسکون و پرامن نہ رہے۔ اس لیے امیر جماعت نے مقامی ارکان شوریٰ اور دوسرے مقامی ارکان جماعت کے مشورے سے فیصلہ کیا ہے کہ:

پٹنہ صوبہ بہار کا اجتماع عام (جو ۴، ۵، ۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو منعقد کیا جا رہا تھا) منسوخ کر دیا جائے۔ اب اس کے بجائے ہندوستان کے چاروں حلقوں کے الگ الگ سالانہ حلقہ وار اجتماعات اپریل اور مئی ۱۹۴۷ء میں حسب ذیل طریق پر منعقد کیے جائیں گے۔

(۱) شمالی ہند (پنجاب، دہلی، سندھ، بلوچستان، سرحد اور کشمیر) کا اجتماع ۱۷، ۱۸ جمادی الثانی ۶۶ھ مطابق ۹، ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کو دارالاسلام پٹھان کوٹ میں۔

(۲) مشرقی ہند (یو پی، بہار، بنگال، آسام اور اڑیسہ) کا اجتماع ۳، ۴ جمادی الثانی ۶۶ھ مطابق ۲۵، ۲۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو پٹنہ صوبہ بہار میں۔

(۳) مغربی ہند (راجپوتانہ، وسط ہند، برار اور صوبہ بمبئی) کا اجتماع ۲۴، ۲۵ جمادی الاولیٰ ۶۶ھ مطابق ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو ٹونک راج میں۔

(۴) جنوبی ہند (صوبہ مدراس، ریاست حیدرآباد اور ریاست میسور وغیرہ) کا اجتماع ۳، ۴ جمادی الثانی ۶۶ھ مطابق ۲۵، ۲۶ اپریل کو مدراس میں تھا۔ لیکن وہاں کے کارکنوں نے اطلاع دی ہے کہ مدراس شہر میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ وہاں اپریل میں اجتماع منعقد نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس اجتماع کو سردست ملتوی کر دیا گیا ہے۔

— مشرقی ہند کے اجتماع میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز شریک ہوں گے۔

— مغربی ہند اور جنوبی ہند کے اجتماعات میں امیر جماعت اور قیم جماعت شریک ہوں گے لیکن امیر جماعت کی خرابی صحت کی وجہ سے جنوبی ہند کا دورہ منسوخ کر دیا گیا ہے۔

— ہر حلقے کے تمام ارکان اپنے حلقے کے اجتماع میں لازماً شریک ہوں گے الّا یہ کہ کوئی عذر شرعی مانع ہو۔ عذر کی صورت میں اجتماع سے پہلے مرکز اور قیم حلقہ کو معذرت کی اطلاع بھیجی جانی چاہئے اور اگر کسی وجہ سے ممکن نہ ہو سکے تو اجتماع کے بعد جلد از جلد معذرت کی نوعیت اور تاخیر کی وجہ بیان کی جانی چاہئے۔

(۵) ایسے ہمدرد اور متاثرین حضرات (خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں) جو ہماری دعوت کو سمجھنے اور ہمارے کام اور طریق کو قریب سے دیکھنے کے خواہشمند ہوں، وہ بھی ان اجتماعات میں شریک ہو سکتے ہیں، ان کی شرکت انشاء اللہ خالی از فائدہ نہ ہو گی۔

(۶) ہر اجتماع میں قیم جماعت اور حلقہ متعلقہ کے قیم صاحبان اپنی اپنی سالانہ رپورٹیں پیش کریں گے۔

(۷) جو لوگ مذکورہ اجتماعات میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہوں، خواہ ہمدرد ہوں یا ارکان ان کو چاہیے کہ اپنی شرکت کے ارادہ کی اطلاع حسب ذیل تاریخوں کے مطابق مندرجہ ذیل حضرات کو بھیج دیں اور اگر کسی گروہ یا جماعت کی طرف سے اطلاع دے رہے ہوں تو ہمراہیوں کی ٹھیک ٹھیک تعداد لکھیں جس میں بعد میں کسی قسم کا رد و بدل نہ ہو۔

(۱) شمالی ہند کے لوگ ناظم اجتماع دار الاسلام، پٹھان کوٹ، پنجاب کو ۲۵ اپریل تک۔

(۲) مشرقی ہند کے لوگ سید محمد حسنین صاحب دفتر جماعت اسلامی، سلطان گنج، مہندرو، پٹنہ (Sultan Ganj, Mahendroo, Patna) کو ۱۰ اپریل ۴۷ء تک۔

(۳) جناب محمد یوسف صاحب صدیقی، مسجد غول، محلہ قافلہ، ٹونک راج کو ۱۰ اپریل ۴۷ء تک۔

نوٹ:- سید محمد حسنین صاحب کا پتہ انگریزی میں لکھا جانا چاہیے۔

(۸) خواتین بھی اپنے اپنے حلقے کے اجتماعات میں شریک ہو سکتی ہیں لیکن خواتین ارکان کے لیے شرکت اجتماع لازم نہیں۔ جو خواتین شریک ہونے کا ارادہ رکھتی ہوں ان کو بھی ہدایت مندرجہ بالا کے مطابق اپنے ارادے کی اطلاع دینی چاہیے۔

(۹) شرکائے اجتماعات کو اپنے اپنے حلقے کے مقام اجتماع پر اجتماع کی پہلی تاریخ کی صبح کو ۸ بجے تک بہرحال پہنچ جانا چاہیے تاکہ وہ اجلاس اول سے اجتماع میں شریک ہو سکیں۔

(۱۰) راشن کی مشکلات کے پیش نظر تمام شرکائے اجتماع ڈیڑھ ڈیڑھ سیر آٹا یا چاول اور تین تین چھٹانک شکر اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ سب احباب کو احتیاطاً راستے کے لیے بھی کھانا لے کر چلنا چاہیے۔

(۱۱) سب لوگ موسم کے مطابق بستر بھی لے کر اجتماع میں شریک ہوں۔ اجتماعات کی تاریخوں میں تقریباً ہر جگہ گرمی شروع ہو چکی ہوگی۔

تنبیہ:۔ تمام شرکائے اجتماع سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ دوران اجتماع میں ارکان جماعت کی طرح ضوابط جماعت کے پابند رہیں گے اور اجتماع کے وقار، سنجیدگی اور اس کی دینی فضا کو ہر لحاظ سے قائم رکھنے میں پورا تعاون فرمائیں گے۔

سفر کے دوران میں حتی الامکان اسلامی اخلاق کی پابندی اور اپنے مسلک کی صحیح نمائندگی کی کوشش کی جائے۔

اگر خدانخواستہ راستے میں کہیں بدامنی یا خطرے کی صورت پیش آجائے تو ہمارے ارکان کا فرض ہے کہ اپنے سب شرکائے سفر (ہندو ہوں یا مسلمان) کو پرامن رکھنے کی کوشش کریں، اور ان میں مظلوم کی حفاظت کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہانے سے دریغ نہ کریں۔

ضروری ہدایت:۔ ہر اجتماع کے ناظم صاحب اپنے مقامی ریلوے اسٹیشن اور بس اسٹینڈ سے اجتماع گاہ تک پہنچنے کے ذرائع، راستے، فاصلے اور دوسری ضروری تفصیلات سے شرکائے اجتماع کو جلد از جلد بذریعہ کوثر مطلع کر دیں تاکہ انھیں اجتماع گاہ تک پہنچنے میں دقت نہ ہو۔

خاکسار: طفیل محمد قیم جماعت اسلامی، دارالاسلام، پٹھان کوٹ

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۵/-/-
رسالہ دینیات	۱/۸/-
حقوق الزوجین	۱/۸/-
مسئلہ قومیت	۱/۸/-
مسئلہ جبروقدر	۱/-/-
تجدید و احیائے دین	۱/-/-
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-/-
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۲/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۲/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/-/-
پردہ	۲/۸/-
تنقیحات	۲/۸/-
خطبات	۲/۲/-
تفہیمات	۳/۸/-
حقیقت توحید	۱/۲/-
اسلام اور ضبط ولادت	-/۱۲/-
ہیگل مارکس اور نظام اسلام	۲/۸/-
رسالہ دینیات (انگریزی)	۳/۸/-
اسلام کیا ہے (انگریزی)	۱/۸/-
ایمان کے بعد کیا (")	-/۱۲/-
سلامتی کا راستہ	-/۶/-
اسلام کا نظریہ سیاسی	-/۶/-
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	-/۶/-
انسان کا معاشی مسئلہ	-/۶/-
اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر	-/۶/-
نیا نظام تعلیم	-/۶/-
دین حق	-/۶/-
اسلام اور جاہلیت	-/۶/-
ایک اہم استفتا	-/۲/-
دستور جماعت اسلامی	-/۲/-
روداد جماعت اسلامی حصہ اول	-/۱۰/-
روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۹/-
روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۱/-/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

دارالاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)

مطبوعہ رپن پریس، لاہور